پہچان

تیج بہادر

تاریخ اِشاعت۔ مئی ۱۹۸۰ء

تعداد ۔ ۱۰۰۰ (ایک ہزار) بار اوّل۔

مطبع ۔ ویلی پرنٹنگ پریس۔ بڈشاہ پل سرینگر۔

قیمت ۔ 6 روپے

کاتب ۔ حاجی غلام رسول سرینگر۔

مصنف تیغ بہادر بھان۔ فلڈ کالونی۔ خواجہ باغ بارہمولہ۔ کشمیر۔

سرورق ڈیزائین ترمل بھان

اِنتساب

اپنے دوست

شمیم احمد شمیم

کے

نام

"مجھے تلاش نہ کر مضمحل کناروں میں"

پیش لفظ

موجودہ دور میں غیر معمولی سائنسی، تکنیکی اور فکری پیش رفت کے نتیجے میں انسانی خارجی زندگی میں برق رفتاری سے تبدیلیاں ہو رہی ہیں جن کی وجہ سے انسانی شعور اس حد تک متاثر ہو رہا ہے کہ انسان روایات، ابہام اور توہمات کے شکنجے توڑ کر از سرِ نو اپنی حقیقی ماہیت اور کائنات میں اپنا صحیح مقام تعین کرنے پر مجبور ہو رہا ہے۔

یوں تو دنیا کے عظیم دانشوروں نے وقتاً فوقتاً انسانی وجود کی حقیقی تفسیر قلمبند کر دی ہے۔ لیکن اندازِ بیان اتنے کٹھن تکنیکی، سائنسی پیرائے میں ہوا ہے کہ عام آدمی اِن سے مستفید ہونے میں ناکام رہا ہے۔ جس کا بیّن ثبوت دورِ حاضر پر مسلط انتہا پسندی، رجعت پرستی اور بدحالی ہے۔

میں نے بھی حتی المقدور سائنسی اور فکری پیش رفت کو تکنیکی، سائنسی اصطلاحات کی حصار سے نکال کر کہانیوں اور قصوں کے روپ میں عوام کے سامنے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ [illegible] میری کاوشوں کو سراہا

لیکن کہانیوں قِصّوں کے لوازِمات مثلاً منظر کشی، رُوحانیت، لفاظیت میں بھٹک کر ایک بار پھر اصلی مفہوم سے بے بہرہ رہے ہے۔

زیرِ نظر کتاب کو لکھتے وقت میں نے ایسی زبان اور پیرائے کو اپنانے کی کوشِش کی ہے جو عام آدمی کی سوچ اور سمجھ سے بالاتر نہیں۔ اب کی بار میں اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اِس کا فیصلہ قارئین کِرام ہی کر سکتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ اِس کتاب کے مُطالعے سے قارئین اپنے گِراں قدر خیالات سے مجھے آگاہ کرنے کی زحمت گوارہ کریں گے۔

۲۰ر اپریل ۱۹۸۰ء۔

تیج بہادر۔

فُلڈ کالُونی خواجہ باغ بارہ مولہ کشمیر۔

اِنسان ماں کی کوکھ سے جنم لے کر جب کائینات میں وارد ہوتا ہے تو انسان اس حالت میں نہیں ہوتا ہے کہ تجزیہ کر سکے کہ وہ کہاں سے آیا! کس لئے آیا! کیونکر آیا! اور آ ہی گیا ہے تو وہ ہے کیا۔ ہوا کا جھونکا، لڑھکتا مٹی کا ڈھیلا، بہتے پانی کا قطرہ یا صرف گوشت پوست کا لوتھڑا۔

لیکن جنم لینے کے ساتھ ساتھ انسان کے جسم میں کچھ ایسی صفات ملتی ہیں جو ہوا کے جھونکے، لڑھکتے مٹی کے ڈھیلے، یا بہتے پانی کے قطرے میں عیاں نہیں ہوتی ہیں۔ اِنسان کو بھوک لگتی ہے۔ زبان میں ذائقے کی حس ہوتی ہے۔ ناک میں سونگھنے کی طاقت ہوتی ہے۔ وہ دیکھ سکتا ہے، بول سکتا ہے، سُن سکتا ہے۔ لمس کا احساس سارے جسم میں رواں ملتا ہے۔ اِنسان زندہ ہوتا ہے۔

عام طور پر اِنسان کے جسم میں ایسی صِفات روح کی موجودگی سے منسوب کی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ روح اِنسان کے جسم میں موجود نہیں ہوگی تو انسان کا جسم زندگی کی مخصوص صفات سے عاری ہوتا ہے۔ حتےٰ کہ اِنسان کا جسم حرکت کرنے سے بھی معذور ہوتا ہے اور اِنسان مردہ کہلاتا ہے۔

اِس لئے اِنسان کو سمجھنے کے لئے اِنسان کا اولین فرض یہ بن جاتا ہے۔ کہ روح اور روح سے منسلک صِفات کا منبع اور اصلی منبع کھوج لے۔ چونکہ اِنسان کا

جسم مادے کا بنا سمجھا جاتا ہے۔ اور مادے سے بنا اِنسان کا جسم اِنسان کے پاس کھوج، مشاہدے اور تجربوں کے لئے حاضر ہے اِس لئے اِنسان اپنی تحقیق مادے سے بنے جسم پر ہی شروع کرنے پر مجبور ہے۔

مادا کیا ہے؟

ہر شکل، ہر شے، ہر چیز جو اِنسان اپنے اِرد گِرد پاتا ہے۔ دیکھتا ہے۔ سُنتا ہے۔ سونگھتا ہے۔ محسوس کرتا ہے۔ مادے کے نام سے پُکارا جاتا ہے۔ ساری کائینات مادے سے بنی تصور کی جاتی ہے۔ چاند، ستارے، سورج، زمین سمندر، پہاڑ، ہوا، پتھر، لوہا، گوشت پوست، گھاس پھوس، میز کرسیاں، مکان باغات، برتن بانڈے، چرند پرند غرضیکہ اِنسان کی رسائی جس بھی کسی شے تک ہوتی ہے وہ مادے کی مختلف صورت ہوتی ہے۔

ریت کے ڈھیر کو دیکھئے۔ مادے کی ایک عام سی صورت نظر آتی ہے۔ ریت کے ڈھیر پر روشنی کی کرن پڑتی ہے۔ ریت کے دانے دکھائی دیتے ہیں لیکن روشنی کی کرن ریت کے ڈھیر میں سے گذر نہیں پاتی۔ اِس ریت کے ڈھیر کو کانچ کی چوڑیاں بنانے والے پگھلا دیتے ہیں۔ ریت کے دانے یا ذرے جو ڈھیر کی صورت میں بکھرے پڑے ہوتے ہیں۔ پگھلنے کی حرکت کے زیر اثر ایک نئے انداز (Pattern) میں آپس میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ ریت اِس نئے رشتے کے زیر اثر اپنی حالت (state)

بدل کر کانچ کی حالت اختیار کرتی ہے۔ گو ریت کے مادے کے ذروں میں کوئی بنیادی تبدیلی رونما نہیں ہوتی لیکن ذروں کی نئی حالت (state) ریت کے ڈھیر میں ایک انوکھی صفت کو جنم دیتی ہے۔ اب سے روشنی کی کرن بے روک ٹوک کانچ کے بیچ سے گذر جاتی ہے۔ ریت کا جو ڈھیر انسان کی نظر روک لیتا تھا اب لاکھ جتن کرنے پر بھی انسان کی نظر کو روک نہیں سکتا۔ اور انسان آسانی سے کانچ (ریت کے ڈھیر کی نئی حالت) کے آر پار دیکھ سکتا ہے۔

اسی کانچ کے ٹکڑے کو توڑ پھوڑ کر پھر ڈھیر کی صورت یا حالت (state) میں تبدیل کیا جائے تو کانچ کے ذرے ڈھیر کے ذروں کی نئی حالت میں آ کر کانچ کی مخصوص صفت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اب کے روشنی اس ڈھیر میں سے بالکل گذرنے نہیں پاتی۔

پانی سیال حالت میں ہوتا ہے اور برتن میں سمائے رہتا ہے۔ لیکن یہی پانی بخارات کی حالت میں آجائے تو ایک چھوٹے سے برتن میں سمانے کے بجائے ساری فضا میں آوارہ ہو جاتا ہے۔ ذروں کی حالت کی تبدیلی سے پانی کی صفت بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ جبکہ پانی کے مادے میں کوئی بنیادی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ انہی بخارات کو منجمد کر کے ایک بار پھر پانی کی حالت (state) میں لایا جائے تو پانی کی مخصوص صفات سے آراستہ ہو جاتا ہے۔ اور جو کہیں برف کی صورت میں لایا جائے تو یہ کانچ جیسی

صورت اختیار کر کے کائنات کی مخصوص صفات سے آراستہ ہو جاتا ہے۔

مادے کی کسی بھی شے، صورت، حالت پر تجربہ کیا جائے تو ہر بار یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مادے سے بنی کسی بھی شے کی مخصوص صفات اُس شے میں موجود مادے کے ذرّوں کی مختلف حالتوں (phenomena) پر منحصر رہتی ہیں اور مختلف حالتوں میں مختلف صفات کی ترجمان بنتی ہیں۔

چونکہ یہ ساری کائنات مادے سے تشکیل ہوئی ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ ساری کائنات پر حاوی ہے اور کائنات کے ایک اٹل قانون کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔

انسان کے بدن میں دیکھنے کی صفت آنکھوں کی مرہونِ منت ہے۔ آنکھیں بند ہوں تو انسان دیکھ نہیں سکتا۔ آنکھیں کھلی ہوں تو ساری کائنات دکھائی دیتی ہے۔ کان ہو تو سن سکتا ہے۔ کان نہ ہو تو سن نہیں سکتا۔ زبان ہو تو بول سکتا ہے۔ زبان کٹ جائے تو بول نہیں سکتا۔

روح کی وجہ سے اگر انسان کو دیکھنے کی صفت حاصل ہے تو آنکھ بند کر کے یا آنکھیں پھوڑ کر۔ انسان کیوں دیکھنے کی صفت سے محروم ہو جاتا ہے جبکہ اندھے انسان کے جسم میں روح کی موجودگی کا اعلان سننے، بولنے، سونگھنے اور چھونے کی صفات سے بدستور عیاں رہتا ہے۔ انسان کے کان پھٹ جائیں تو انسان سننے کی قوت سے محروم ہو جاتا ہے جبکہ سمجھنے، بولنے اور حرکت کرنے کی صفات ایک اندھے، بہرے

انسان میں بدستور موجود ہوتی ہیں اور ایسے اندھے بہرے انسان کے جسم میں روح کی
موجودگی کی نشاندہی کرتی ہیں۔

انسان نے تجربے کئے، مشاہدے کئے اور نتیجہ اخذ ہوا کہ انسان کے جسم میں جو
بھی صفات جسم میں روح کی موجودگی سے وابستہ سمجھی جاتی ہیں۔ وہ دراصل انسان
کے جسم میں روح موجود ہونے پر منحصر نہیں بلکہ انسان کے جسم میں مادے کے ذروں کی
مختلف حالتوں یا صورتوں (state) پر منحصر ہوتی ہیں۔

آنکھ گوشت کی بنی ہوتی ہے۔ آنکھ پھوڑ کر بھی آنکھ کی جگہ گوشت قائم رہتا
ہے۔ لیکن گوشت کے ذرے آنکھ کے گوشت کے ذروں کی مخصوص حالت (state)
میں نہیں ہوتے ہیں۔ اس لئے اس گوشت میں دیکھنے کی صفت قائم نہیں رہتی۔ تجربہ کیا جائے
تو پتہ چلتا ہے کہ کان کے مادے کے ذروں کی مخصوص حالت تبدیل ہو جائے تو
انسان سن نہیں سکتا۔ زبان اور گلے کے مادے کے ذروں کی مخصوص حالت برقرار نہ
رہے تو انسان آواز نہیں نکال سکتا۔ اعصاب کے مادے کے ذروں کی حالت
(state) میں تغیر آجائے تو انسان کے جسم میں چھونے اور محسوس کرنے کی صفت زائل
ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب "کلوروفارم" (chloropharm) یعنی بے ہوشی
کی دوا دے کر مریض کے اعصاب کے مادے کے ذروں کی حالت میں کچھ دیر کی تبدیلی
لاکر انسان کی چیرپھاڑ اسی اصول کے تحت کرتے ہیں۔ اور انسان زندہ ہوتے ہوئے بھی

کوئی تکلیف، درد محسوس نہیں کرتا۔ یوں نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ انسان کے جسم میں روح کی موجودگی کا اعلان کرنے والی صفات اصل میں گوشت پوست یا دوسرے الفاظ میں مادے کے ذروں کی مختلف حالتوں (states) کی ترجمانی کرتی ہیں۔

نتیجہ صحیح ہے تو مر کر جب انسان کے جسم سے روح نکل جاتی ہے تو آنکھ اپنی مخصوص حالت میں رہ کر بھی دیکھ نہیں پاتی! ہاتھ پیر اصلی حالت میں ہو کر بھی حرکت کی صفت سے محروم ہو جاتے ہیں! جسم میں کوئی ظاہری تبدیلی نہ رونما ہونے کے باوجود زندگی کی کوئی بھی صفت برقرار نہیں رہتی۔ ضرور روح کوئی چیز ہے جسکی موجودگی سے انسان زندہ کہلاتا ہے اور انسان کے جسم میں زندگی کی مختلف صفات کو جنم دیتا ہے! اِس گتھی کو سُلجھانے کے لئے انسان نے مزید مشاہدے کئے، تجربے کئے۔

انسان نے لوہے کا ٹکڑا دیکھا۔ اِس لوہے کے ٹکڑے میں وزن، لمبائی، چوڑائی، اور سختی کی صفات موجود پائیں۔ اِس لوہے کے اِرد گِرد انسان نے برقی رو (بجلی) دوڑائی۔ برقی رو کی قوت نے لوہے کے ٹکڑے میں جکڑے مادے کے ذروں کو ایک خاص ترتیب یا حالت (state) میں منتقل کر دیا۔ اِس لوہے کے ٹکڑے میں ایک عجیب سی صفت جنم لیتی ہے۔ یہ لوہے کا ٹکڑا کسی غیبی طاقت سے لیس ہو جاتا ہے اور دور سے ہی دوسرے لوہے کے ٹکڑوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ گو وزن، لمبائی، چوڑائی، اور سختی کی صفات میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی لیکن پھر بھی اِس بے روح

لوہے کے ٹکڑے میں روح سے وابسطہ ایک صفت ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے اس لوہے کے ٹکڑے میں کوئی بد روح سما گئی ہو۔ لوہا کسی جانا، یکا ریع لوہے کے دوسرے ٹکڑوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اِس صفت سے زین لوہے کے ٹکڑے کو مقناطیس (Magnet) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

تجربے کی تکمیل کیلئے انسان نے اِس لوہے کے ٹکڑے (مقناطیس) کو زمین پر دے مارا۔ لوہے کا ٹکڑا کا ریح کی طرح ٹوٹا تو نہیں گیا لیکن خاص حالت (state) میں جکڑے ہوئے مادے کے ذرے چوٹ کی طاقت سے منتشر ہو کر بے ترتیب حالت (state) میں آگئے۔ اِس نئی حالت میں آکر لوہے کا ٹکڑا کھینچنے کی مخصوص صفت سے محروم ہو جاتا ہے۔ یا اِس لوہے کے ٹکڑے میں روح سے منسوب، کھینچنے کی صفت قائم نہیں رہتی۔ جبکہ وزن، لمبائی، چوڑائی اور سختی کی صفات بدستور برقرار رہتی ہیں۔

انسان نے سانس (ہوا) ایک خاص شکل یا حالت (state) کی نلکی میں سے گذار دی۔ مرلی کی مدھر لے پیدا ہو گئی۔ روح کی ایک صفت آواز نے جنم لیا۔ ہوا آہستہ سے گذار دی۔ آواز ہلکی ہو گئی۔ ہوا کی رفتار بالکل روک دی۔ ہوا نلکی میں موجود ہونے کے باوجود کوئی آواز نہیں نکلتی۔ ہوا کی رفتار بدستور قائم رکھی لیکن نلکی توڑ دی یا نلکی کی حالت (state) بدل دی۔ تب بھی آواز نہیں نکلی۔

نتیجہ اخذ ہوا کہ ہوا کی خاص حالت (حرکت، رفتار) اور نلکی کی خاص حالت (شکل، مادے کے ذروں کی مخصوص صورت) میں خاص تناسب میں رشتہ قائم ہو جائے تو آواز کی صفت جنم لیتی ہے۔ نلکی کی حالت یا ہوا کی حالت کے تغیر، تبدل سے آواز میں بھی تغیر تبدل واقع ہوتا ہے۔ توازن بالکل بگڑ جائے تو آواز بالکل نہیں نکل پاتی یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں آواز مر جاتی ہے۔

انسان نے لوہے کی ایک صورت یا حالت (state) کو دوسری حالت یا صورت (state) سے ہم آہنگ کیا۔ نٹ بولٹ (Nut Bolt) وجود میں آگیا۔ لوہے کی کئی اور صورتوں یا حالتوں کو آپس میں خاص تناسب سے جوڑ دیا۔ کاربن، ربر، لکڑی اور دیگر مادے کی حالتوں کو خاص صورت یا حالت میں رکھ کر اس ڈھیر میں اضافہ کیا۔ پٹرول، موبل آئیل اور پانی خاص توازن میں میسر رکھے۔ لیجئے موٹر گاڑی تیار ہوگئی، جس میں دوڑنے، رکنے، آواز نکالنے اور موڑ موڑنے کی صفات پیدا ہوگئیں۔ یا موٹر گاڑی میں روح سما گئی۔

موٹر گاڑی میں موجود مادے کی صورتوں (حالتوں) کا کسی طور توازن بگڑ جائے یا اِن مادے کی مجموعی حالت (state) اور رشتہ برقرار نہ رہے تو موٹر گاڑی دوڑنے، رکنے، موڑ مڑنے اور آواز نکالنے کی صفات سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔

انسان سمجھ گیا کہ انسان کے بدن میں مادے کی سب صورتوں کے ذرے چاہیئے

خون کے ذرے ہوں، ہڈی کے ذرے ہوں، گوشت کے ذرے ہوں، ہوا کے ذرے ہوں پانی کے ذرے ہوں، غرضیکہ مادے کی مختلف صورتوں یا حالتوں (states) کے جن ذروں سے اِنسانی جسم کی تشکیل وُجود میں آتی ہے۔ مخصوص حالت اور رشتہ برقرار رکھ سکیں۔ تو اِنسان کے جسم میں کچھ نئی صِفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ جنہیں مجموعی طور پر زندگی کے خوبصورت نام سے نوازا گیا ہے۔

ہوا جو سانس لینے سے اِنسان کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ روک دی جائے تو اِنسان زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ خون نچوڑا جائے تو اِنسان زندگی سے محروم ہو جاتا ہے۔ جراثیم کلیجے، پھیپھڑے، دل یا دماغ کے مادے کے ذروں کی مخصوص حالت بگاڑ دیں تو بھی اِنسان مر جاتا ہے۔ اور جو کہیں گرتے پتھر، درخت یا دوڑتی موٹر گاڑی کی زد میں آکر کچل جائے۔ تو بدن بدستور موجود ہوتے ہوئے بھی انسان بدن کے ذروں کی مخصوص حالت، صورت (state) کا توازن بگڑ جانے سے لقمہ اجل ہو جاتا ہے۔

لگاتار مشاہدوں، تجربوں اور کھوج نے انسان پر جب واضح کر دیا کہ اِنسان کے بدن میں روح کی کوئی حقیقت نہیں۔ بلکہ اس کا تذکرہ لاعلمی اور کچے مشاہدے کی علامت ہے۔ سورج، چاند، ستارے، زمین۔ زمین پر کھڑے پہاڑ، درخت، سمندر، گرمی، روشنی، غرضیکہ ساری کائنات کی تشکیل

دراصل مادے کے ذروں کی مخصوص حالت (state) میں برقرار رہنے کی مرہونِ منت ہے۔ اور کائنات میں تغیر و تبدل اصل میں مادے کے ذروں کی حالت میں تغیر و تبدل پر قائم ہے تب وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا۔ کہ اس تغیر و تبدل، رد و بدل، حرکت، موت اور زندگی کے پیچھے کوئی قوت کارفرما ہوگی۔ جس سے کائنات ہر لمحہ، ہر پل صورت یا حالت (state) بدلتی رہتی ہے۔

صدیوں کے مشاہدے اور تجربوں نے انسان کے سامنے مادے کی ایک اٹل حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے کہ اس ساری کائنات میں جو شئے، چیز جس حالت میں ہوتی ہے حالت بدلنے پر تیار نہیں جب تک کہ اردگرد ماحول میں بکھری مختلف صورتیں یا حالتیں یلغار کر کے اُس چیز یا شئے کو حالت بدلنے پر مجبور نہ کریں۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کائنات میں ہر شئے ماحول کے طابع رہتی ہے۔ ماحول بدل جائے تو ہر شئے اپنی حالت بدل دینے پر مجبور ہوتی ہے۔ اور نئی حالت (state) نئے ماحول کے طابع ہو جاتی ہے۔

ہر لمحے مثالی ماحول میسر نہیں رہتا۔ یوں کوئی بھی شئے پل بھر کے لئے بھی اپنی حالت بدستور برقرار نہیں رکھ سکتی۔ لیکن انسان نے دیکھا کہ ہر شئے ماحول میں تغیر و تبدل کے باوجود مناسبت سے اپنی صورت برقرار رکھتی ہے۔ مشاہدوں اور تجربوں سے عیاں ہوا کہ ہر شئے میں "ڈھیل" (Cohesion) موجود ہوتی ہے اور ڈھیل کی

مقدار مادے کے ذروں کی مخصوص حالت، مقدار اور تناسب پر منحصر ہوتی ہے۔ پتھر کے مادے کے ذروں میں ڈھیل اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ کافی قوت کے استعمال سے بھی پتھر نہیں ٹوٹتا یا اپنی حالت نہیں بدلتا جبکہ مٹی کے مادے کے ذروں میں ڈھیل اتنی کم ہوتی ہے کہ تھوڑی سی قوت سے ریزہ ریزہ ہوجاتی ہے۔ "ڈھیل" دراصل مادے کی حالت (استعداد) کی ترجمانی کرتی ہے۔

پانی کے ذروں کی ماہیت ایسی ہوتی ہے کہ تھوڑی سی حرارت سے پانی صورت نہیں بدلتا۔ پانی کی صورت بدلنے، یا بخارات کی حالت میں لانے کیلئے کافی حرارت (قوت) کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب تک نہ حرارت اتنی بڑھ جائے کہ پانی کے ذروں میں موجود ڈھیل کی قوت پر اثر انداز ہو تب تک پانی کی حالت میں تبدیلی نہیں آتی۔

ڈھیل چونکہ مادے کے ذروں کے تناسب سے ہر شے میں ہوتی ہے۔ اس لئے مادے کے ذروں کی مقدار زیادہ ہو تو شے کی حالت ٹھوس، بھاری، سخت ہوگی جیسے لوہا، پتھر اور دیگر دھاتیں۔ مادے کے ذروں کی مقدار کم ہو تو ہر شے میں اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے کی ڈھیل (قوت) کم ہوگی اور شے سیال، نرم، ہلکی ہوگی جیسے پانی، ہوا ربڑ، مٹی وغیرہ۔ مادے کی اس خاصیت کو انسان نے فطرت کے نام سے وابستہ کیا۔

راستہ چلتے چلتے انسان کے سامنے پتھر آگیا۔ چونکہ انسان ابھی کائنات کے اصولوں، حقیقتوں سے ناآشنا تھا اس لئے وہ اپنی فطرت سے مجبور ہوکر پتھر سے ہیبت زدہ

گذر نہیں کرتا ہے۔ پتھر ٹس سے مس نہیں ہوتا اور اپنی مخصوص حالت (state) بدستور قائم
[illegible]
کی حالت (state) بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان کی قوت، پتھر کی حالت (state) کی قوت کم ہو تو پتھر ہلنے کا نام نہیں لیتا۔ لیکن انسان کی قوت پتھر کی حالت کی قوت (ڈھیل) سے زیادہ ہو جائے تو پتھر لڑھک کر ایک نئی حالت میں آجاتا ہے۔ انسان آگے بڑھ جاتا ہے۔ لیکن پتھر لڑھک کر واپس اپنی پرانی حالت (state) میں آنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ پتھر نئی حالت (state) کی قوت کے طابع ہو جاتا ہے۔ یا نئے ماحول کے طابع ہو جاتا ہے۔ پتھر کی اس حالت کو بدلنے کیلئے یا اس کو پرانی حالت پر لانے کیلئے انسان کو ایک دفعہ اور پتھر کے ساتھ زور آزمائی کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

کائینات میں اس ڈھیل سے بظاہر ٹھہراؤ نظر آتا ہے لیکن باطن میں کائینات ہر پل، ہر لمحہ حرکت میں مبتلا ہے۔ مٹی میں دبا بیج بظاہر مٹی کی حالت کی قوت میں جکڑا رہتا ہے۔ لیکن بیج کی حالت کی قوت مٹی کا سینہ چیرتی رہتی ہے۔ اور مٹی کو خوراک کی صورت یا حالت میں بدل کر اپنے اندر مدغم کر کے درخت کی حالت اختیار کرتا ہے۔ درخت اپنی حالت کی قوت کے زیر اثر سربلند رہنا چاہتا ہے لیکن چلتی ہواؤں کی حالت کی قوت اسے اکھاڑ پھینکتی ہے۔ گرا [illegible] درخت گرنا حالت کی قوت (ماحول) کے [illegible] اور گرنے کی حالت میں بدستور رہنا چاہتا ہے لیکن انسان کے بازو

اُس کی حالت بدل دیتے ہیں۔ انسان کا جسم اپنی حالت بدل کر درخت پر قوت صرف کرنے پر تیار نہیں لیکن انسان کے اردگرد ماحول کی حالت، سردی طوفان کی یلغار انسان کے دماغ اور بازوؤں کی حالت بدلنے پر مجبور ہیں۔ اور انسان گرے درخت کو ایندھن کی حالت میں منتقل کرتا ہے۔ اپنے بدن کی مخصوص حالت، سردی گرمی کی حالت کی زور آزمائی کے خلاف بدستور برقرار رکھنے کے لئے ایندھن کی حالت کو جلا کر بدل ڈالتا ہے لیکن ایندھن جلنے کی حالت کی قوت انسان کے بدن کی حالت جھلسا کر راکھ کی حالت میں منتقل کرتی ہے۔ یہ سلسلہ لاانتہائی ہے۔ کائنات کی جس شئے کا، جس ماحول کا، جس بھی حرکت کا مشاہدہ انسان نے کیا۔ اُس میں یہی ایک رازِ پنہاں پایا کہ کائنات کی ہر شئے حتیٰ کہ کائنات بذات خود اپنی صورت حالت (state) یا وجود تب تک قائم رکھتی ہے جب تک کہ خارجی قوتیں یلغار کر کے اُس کی حالت (state) نہ بدل دیں۔

انسان بیمار ہو کر درد سے تڑپ رہا ہے۔ اُس کے بدن سے خون اور پیپ بہہ رہی ہے۔ جسم سڑ رہا ہے۔ وہ قریب المرگ ہے۔ تجربے اور مشاہدوں سے وہ جان چکا ہے کہ اب وہ کسی صورت بچ نہیں سکتا اور چند لمحوں کا مہمان ہے۔ ایسے بیمار، ناتوان، قریب المرگ انسان کو سمجھایا جائے کہ اس حالت میں رہ کر ناحق اتنی تکلیف [illegible] جلن میں مبتلا رہنے سے بہتر [illegible] ابھی اسی وقت اُس کو مار کر،

درد و کرب سے نجات دلا دی جائے تو ایسی بُری حالت میں ہو کر بھی انسان کبھی صورت اقرار پر آمادہ نہ ہوگا۔ ایسا انسان بھی اپنے جسم کی ایسی حالت بدلنے پر تیار نہیں ہوگا۔

یہ تو عام کم علم انسان کی بات ہوئی۔ کسی عامل کامل کو سمجھایا جائے کہ مر کر تو وہ خدا کے حضور پہنچ ہی جائے گا۔ برسوں بعد خدا کے حضور پہنچنے کی سعی کرنے کے بجائے کیوں نہ اُس کو ابھی اسی وقت مار کر خدا کے حضور پہنچنے کا موقعہ دیا جائے تو عیاں ہوتا ہے کہ روحانی کامل ہو کر بھی انسان اپنی حالت (state) بدلنے پر تیار نہیں۔ بلکہ بیماری کی یلغار سے اپنی حالت کو بدستور برقرار رکھنے کے لئے ڈاکٹروں حکیموں کی منت، زاری کرتا ہے۔ حالانکہ اُس کا اولین اعلان اور خواہش ہوتی ہے کہ اس فانی مادی دنیا کے عذاب سے چھٹکارہ پا کر جلد سے جلد خدا کے حضور پہنچ جائے اور نجات حاصل کرے۔

اِنسان نے آنکھوں سے دیکھا کیونکہ آنکھ کے ذروں کی مخصوص حالت اس صفت کو جنم دیتی ہے۔ آنکھوں نے اعصاب کے ذریعے دماغ کو آگاہ کیا کیونکہ اعصاب میں خبر لے جانے کی صفت ذروں کی خاص حالت میں ہونے کی وجہ سے موجود ہوتی ہے۔ دماغ نے سوچا کیونکہ انسان کے دماغ میں سوچنے کی صلاحیت مادے کے ذروں کی مخصوص حالت کی مرہونِ منت ہے

دماغ کے ذروں کی مخصوص حالت (تناسب) میں کمی بیشی دماغ کی قوت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مادے کے ذرے مخصوص حالت میں نہ ہوں تو دماغ کمزور ہوتا ہے۔ سوچ بھی کم ہوتی ہے۔ اور کئی باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آتیں۔ بچے کا دماغ ذروں کے مخصوص حالت کی وجہ سے کمزور ہوتا ہے۔ اُس کو آگ کی حالت سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ ہاتھ بڑھا کر آگ کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ تجربہ وجود میں آتا ہے۔ بچے کا ہاتھ جل جاتا ہے یا بچے کے ہاتھ کے ذروں کی مخصوص حالت بدستور برقرار نہیں رہتی۔ جسم کے ذروں کی مجموعی حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے دماغ کے ذروں میں تبدیلی رونما ہوتی ہے اور دماغ اپنے ذروں کی حالت میں تبدیلی لا کر تجربے کو ذہن میں مُقید کرتا ہے۔ دماغ میں یادداشت کی صفت جنم لیتی ہے اور یادداشت علم کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔

ٹیپ ریکارڈر (Tape Recorder) میں آواز اسی اصول کے تحت مُقید کی جاتی ہے۔ ٹیپ ریکارڈر کے فیتے پر لوہے کے ذرے بکھرے ہوتے ہیں۔ برقی رو کی مدد سے فیتے پر لگے لوہے کے ذروں کی حالت تبدیل کر کے خاص حالت (state) میں لائی جاتی ہے۔ اور آواز برقی رو میں منتقل ہو کر فیتے پر بکھرے لوہے کے ذروں کی حالت تبدیل کر کے خاص حالت میں لائی جاتی ہے۔ آواز برقی رو میں منتقل ہو کر لوہے کے ذروں کی مخصوص حالت اختیار کرتی ہے جب تک فیتے پر لوہے کے ذروں کی حالت برقرار رہے گی تب تک فیتے (ٹیپ) میں مخصوص آواز پنہاں رہتی ہے۔ ٹیپ ریکارڈر سنتے وقت لوہے کے

ذروں کی مخصوص حالت (یاداشت) دوبارہ آواز کو جنم دیتی ہے۔ اس طرح اس ٹیپ کی یاداشت کو کئی دفعہ آواز میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ نئی آواز بھرتے وقت لوہے کے ذرے پرانی حالت بدل کر نئی آواز کی مخصوص حالت میں آجاتے ہیں۔ یوں پرانی آواز مٹا کر ٹیپ میں نئی آواز مقید ہو جاتی ہے۔ جتنا لمبا ٹیپ ہو یا ٹیپ پر جتنے زیادہ لوہے کے ذرے ہوں۔ اتنی زیادہ آوازیں ٹیپ کی جا سکتی ہیں۔ ٹیپ اُتار کر رکھ لیا جائے تو مختلف آوازیں (یاداشتیں) تب تک مقید رکھی جا سکتی ہیں جب تک کہ ٹیپ پر لوہے کے ذروں کی حالت برقرار رہے گی۔

انسان کے دماغ میں مادے کے ذروں کی تبدیلی ماحول سے ہر حرکت، ہر جنبش ہر تجربے کو ٹیپ ریکارڈر کی طرح مختلف انداز میں مقید کرتی جاتی ہے۔ یاداشت بڑھ جاتی ہے۔ علم بڑھ جاتا ہے اور دماغ بالغ کہلاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ انسان کے دماغ کی مخصوص صفات سوچ، سمجھ، پرکھ کائنات کی حرکات، کشمکش تغیر و تبدل پر قائم ہیں۔ کائنات میں حرکت نہ ہو تو تجربہ نہیں ہوگا۔ تجربہ نہیں ہوگا تو نتیجہ نہیں مل سکتا۔ نتیجہ نہیں مل سکتا تو کائنات کے راز افشاء نہیں ہو سکتے۔ تجربے کی کمی اور مشاہدے کی کمی کی وجہ سے کائنات میں محرک کچھ حادثے، حرکتیں، تغیر تبدل انسان کی کمزور سمجھ سے بالاتر رہے۔ ایسے محرکات کو علم کی کمی کی وجہ سے انسان نے مافوق الفطرت کے نام سے منسوب کیا۔

بجلی کڑکی۔ درخت جل اُٹھا۔ اِنسان کے دماغ میں آگ لگنے کے محرکات ناشنیع نہ تھے۔ انسان نے ہاتھ بڑھایا۔ ہاتھ جل گئے۔ ہاتھ اور جسم کی حالت بدستور برقرار نہ رہی۔ آگ کو اپنے سے زیادہ طاقتور پاکر گھبرا گیا۔ علم کی کمی کی بنا پر آگ کو مافوق الفطرت سمجھ بیٹھا۔ آگ کو اگنی دیوتا (طاقتور) کا نام دیا اور آگ کی منت زاری (پوجا) کرنے لگا۔ تاکہ آگ کی زبردست قوت کے سامنے اپنی جسم کی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔

ہواؤں کے طوفان کے سامنے ایک نہ چلی، وایو دیوتا (بھگوان) ایجاد کیا۔ چیچک کے مرض کو شتلا دیوی کی طاقت سے منسوب کیا۔ غرضیکہ ہر اُس قوت کو، چیز کو، شئے کو، بھگوان کے روپ سے منسوب کیا جو انسان کے جسم کی مخصوص حالت بدستور برقرار نہ رکھنے پر تل جاتی تھی۔ چونکہ انسان اِرتقا کی اُس منزل پر کھڑا تھا جہاں تجربے مشاہدے، اور یاد اشت (علم) کی کمی تھی۔ اِس لئے اِنسان ایسی قوتوں کے ماخذ سے ناآشنا تھا۔ بے بس ہو کر اُس نے اِن سب بڑی قوتوں کو مجموعی طور پر ایک بہت بڑی طاقتور شخصیت سے منسوب کیا۔ اور اِس بڑی طاقت کو "پرماتما، خدا، گاڈ" یعنی (Almighty) کا نام دیا۔

اِس دوران تجربے ہوتے رہے۔ مشاہدے ہوتے رہے اور انسان پر واضح ہو گیا کہ کسی بھی شے کا راز جاننے کے لئے اُس شے کو توڑ پھوڑ کر اُس کے اندر چھپے راز آشکارا

ہوتے ہیں۔ بند صندوق میں کیا ہے؟ صندوق کو کھول کر ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ دماغ کی شبہہ پا کر انسان نے مادے کے مختلف اجسام کو توڑنا پھوڑنا شروع کیا۔ جتنے کہ سب اجسام باریک ذروں کی صورت میں منتقل ہو گئے۔ ان ذروں کے مشاہدے اور معائنے کے دوران انسان کے سامنے ایک ایسی نئی انوکھی حقیقت کا انکشاف ہوا کہ انسان دنگ رہ گیا۔ انسان جو ذرے ٹھوس مادے کی صورت میں دیکھتا آیا ہے۔ جن مادے کے ذروں کی لمبائی چوڑائی ہے۔ جن مادے کے ذروں میں سختی، نرمی ہے۔ جو مادے کے ذرے انسان دیکھ سکتا ہے۔ چھو سکتا ہے۔ محسوس کر سکتا ہے، دراصل مادے کے ٹھوس ذرے نہیں بلکہ صرف حرکت یا قوت سے تشکیل ہوئے ہیں۔ اس حقیقت نے انسان کے ذہن میں ظاہری شکل و صورت اور حالت کی بنیاد پر کھڑے مادے کے تصور کو چور چور کر کے رکھ دیا۔

انسان پرمانو (Atom) کی منزل پر پہنچ کر ایک نئی سوچ میں مبتلا ہو گیا۔ انسان نے دیکھا مادے کا مہین ذرہ (Atom) اور بھی مہین قوت کے ذروں سے تشکیل ہوا ہے۔ پہچاننے کے لئے انسان نے ان ذروں کو الیکٹرون (Electron) پروٹون (Proton) نیوٹرون (Neutron) اور ایسے ہی کئی نام عطا کئے۔ الگ الگ نام اس لئے دئے کہ قوت کے یہ ذرے حجم (Size) اور طاقت (Potential) میں ایک دوسرے سے مختلف تھے کسی ذرے کی طاقت دوسرے ذرے سے کم تھی۔

کسی ذرے میں طاقت دوسرے ذرے سے زیادہ تھی اور کسی ذرے کی طاقت کا اثر دوسرے ذروں پر بالکل نہ تھا۔

جب یہ مختلف طاقت کے ذرے مختلف مقدار اور مختلف حالتوں میں ایکدوسرے سے منسلک ہو جاتے ہیں تو مادے کے مختلف روپ دھارن کرتے ہیں یعنی مخصوص گنتی (مقدار) کے ذروں میں کمی بیشی مادے کی مختلف حالتیں اور حرکتیں پیدا کرتی ہیں۔ انسان ذروں میں کمی بیشی کر سکے تو لوہے کو سونا بنا سکتا ہے۔ پتھر کو پانی کی شکل دے سکتا ہے۔ پانی سے انسان بنا سکتا ہے۔ انسان کو درخت میں منتقل کر سکتا ہے۔ کیا کچھ نہیں کر سکتا؟ غرضیکہ کائنات کی کسی بھی شئے یا صورت کو کسی بھی دوسری شئے یا صورت میں منتقل کر سکتا ہے۔ جو چاہیئے کر سکتا ہے لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ ایٹم (Atom) کے اندر مہین قوت کے ایسے ذرے اتنی تیز قوت سے ایکدوسرے سے منسلک ہیں کہ کسی بڑی طاقت کے استعمال کے بغیر ان قوت کے ذروں کی طاقت کو زائل کر کے ان کو الگ کرنا یا ان کی مخصوص مقدار میں کمی بیشی کرنا محال ہے۔ یوں انسان پر یہ راز عیاں ہو گیا کہ کائنات کی ہر شئے اپنے ذروں کی حالت (state) بدستور برقرار رکھنے کی صفت کے لئے اسی طاقت کی مرہون منت ہے۔ اور یہی طاقت ہر شئے میں ڈھیل کی صورت میں نمایاں رہتی ہے۔ تب انسان یہ بھی سمجھ گیا کہ کائنات کے لامحدود قوت کے زیر

اثر ہر شئے میں تغیر و تبدل اپنی طاقت کے ذروں کی کمی بیشی کو ظاہر کرتی ہے۔ لکڑی جل کر راکھ میں تبدیل ہوتی ہے۔ پانی تبدیل ہو کر آکسیجن (oxygen) ہائیڈروجن (Hydrogen) بن جاتا ہے۔ چاول، گیہوں، خوراک، گوشت۔ خون اور ہڈی میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ بیج لکڑی پیدا کرتا ہے اور انڈا جاندار کی صورت اختیار کرتا ہے۔

کائنات کا ارتقاء تھم نہیں سکتا۔ ہر دن تجربے وجود میں آتے رہے۔ علم میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور انسان اس منزل پر پہنچ گیا کہ وہ ایٹم کو پارہ پارہ کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ذروں میں پنہاں قوت کا آبشار اتنی تیزی سے اُبل پڑا کہ ارد گرد سب چیزیں تہس نہس ہو گئیں۔ قوت کا آبشار جس چیز سے ٹکرا گیا اُس چیز کو پارہ پارہ کر کے طاقت کے ذروں میں تبدیل کرتا گیا "Chain Reaction" شروع ہو گیا۔ اشیاء مٹ گئے۔ اجسام مٹ گئے۔ اشکال مٹ گئے مادا مٹ گیا اور طاقت کا بحر بیکران سرگرداں ہو گیا۔ دُنیا میں ایٹم بم (Atomic Bomb) وجود میں آگیا۔

انسان ڈر گیا۔ کہیں یہ لا انتہائی سلسلہ (Chain Reaction) طاقت کے ذروں کی یلغار بڑھتے پھیلتے ساری دُنیا کو اپنی لپیٹ میں نہ لے اور بڑھتے پھیلتے ساری کائنات کو طاقت کے ذروں میں منتقل نہ کر دے۔

ساری کائینات ایک نیا مہیب سورج نہ بن جائے جہاں "Chain Reaction"
جاری ہونے کی صورت گرمی، روشنی اور دھوپ کی صورت میں آسمان کو منور
کرتی ہے۔ لیکن کائینات میں پھیلی مادے کی مختلف صورتوں، حالتوں کی مجموعی
قوت (ماحول) نے دھیرے دھیرے ایٹم کی طاقت کو جذب کر کے یا ایٹم کی طاقت
کو ٹھنڈا کر کے ایک بار پھر مادے کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ اور کائینات اپنی
حالت بدستور برقرار رکھنے میں کامیاب رہی۔

انسان کے ذہن میں "Chain Reaction" اور ایٹم کے طریقۂ کار نے
نئی سوچ کو جنم دیا۔ کسی طور اگر کائینات کی ہر شئے مہین طاقت کے ذروں
میں منتقل ہو جائے تو کائینات کے کونسے حدود برقرار رہینگے۔ کیسے حدود
ہونگے۔ کیا حدود ہونگے۔ شاید کچھ بھی نہیں !

ہر شئے کا حدود اربعہ اور صفات دوسرے اشیاء کے حدود اربعہ
اور صفات کی بنا پر وجود میں آتا ہے۔ لوہے کی سختی تب محسوس ہوتی ہے جب
نرم ہاتھ کا لمس میسر رہے۔ ہر شئے لوہے کی بنی ہو تو لوہے کی سختی، نرمی اور دیگر
صفات کا موازنہ کرنا ناممکن ہے۔ کسی بھی شئے کا موازنہ کرنے کیلئے پیمانے کی
ضرورت ہوتی ہے۔ کائینات میں بکھری مادے کی ہر صورت مادے کی ہر دوسری صورت
کا پیمانہ ہے۔ سفید دھبا سفید دیوار پر بالکل نہیں دکھائی دیتا لیکن کالی

دیوار پر پھوٹ پڑتا ہے۔ پانی کے ڈھیر میں پانی کے قطرے کا کوئی وجود نہیں۔ لیکن قطرے کو پانی کے ڈھیر سے الگ کر کے اُنگلی کے پیمانے پر تولئے تو پانی کے قطرے کی مخصوص صفات آشکارا ہو جاتی ہیں۔ زبان کے پیمانے پر تولئے تو ذائقے کی صفت عیاں ہو جاتی ہے۔ اُتار چڑھاؤ کے پیمانے پر تولیئے تو سیال کی صفت پائی جا سکتی ہے۔ (Relative محرکات) انہی محرکات کو کہتے ہیں۔

اِنسان اپنے آپ کو اِنسان کے نام سے نوازتا ہے۔ اِنسان کی مخصوص ناک ہے، کان ہے، سر ہے، ہاتھ پیر ہیں۔ انسان مخصوص انداز میں کھڑا ہو سکتا ہے۔ بول سکتا ہے۔ اِنسان کا دماغ مخصوص حالت میں ہے۔ بدن خاص تناسب میں ہے۔ اور تب اِنسان اِنسان کہلاتا ہے۔

انسان کا تناسب بدل جائے۔ اِنسان کی حالت بدل جائے۔ درندہ بن جائے انسان جل کر راکھ ہو جائے تو اِنسان اِنسان نہیں کہلائیگا۔ بلکہ راکھ کا ڈھیر کہلائیگا۔ دُم پیدا ہو گی تو بندر کہلایا جائیگا۔ سینگ اور دُم ہو گی تو شاید بیل بکری کے نام سے پکارا جائیگا۔

یوں اگر ساری کائینات کے ساتھ ساتھ انسان بھی طاقت کے ذروں کی حالت میں منتقل ہو جائے تو اِنسان بھی کائینات میں موجود ہر شئے کے ساتھ ساتھ اپنی مخصوص اِنسانی حالت سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ طاقت کے ذروں کے بحر بیکراں میں

انسان کی حیثیت کچھ بھی نہ ہوگی۔ جیسے اک قطرے کی حیثیت بھی نہ ہوگی۔ کائینات کی ہر شئے اپنا اپنا وجود کھو کر ہر اور شئے میں مدغم ہو جائیگی نہ کوئی چیز پرکھی جائیگی۔ نہ کسی چیز کا مشاہدہ ہو سکیگا۔ کسی بھی شئے یا چیز کی الگ حیثیت برقرار نہیں رہیگی۔ نہ درندوں کی، نہ پرندوں کی، نہ جنگلوں کی، نہ پہاڑوں سمندروں کی، نہ ستاروں سیاروں کی، نہ دیوتاؤں انسانوں کی۔ سب ایک ہو جائینگے۔ ہر چیز بڑی چیز میں سما جائیگی اور بڑی چیز ہر چھوٹی چیز کے بل بوتے پر قایم ہوگی۔

خدا (GOD) پرماتما کی تشکیل انسان نے دماغ کی مخصوص صفت سوچ کے تحت کی ہے۔ وہ بھی تب جب مادے کے ذلے دماغ کی مخصوص حالت میں قایم تھے۔ انسان نہیں رہیگا، انسان کا دماغ نہ رہیگا۔ مادانہ رہیگا تو سوچ اور سمجھ کی صفت بھی نہیں رہیگی۔ اور اس مرحلے پر بھگوان کا تصور بھی قایم نہیں رہیگا۔

انسان کے دماغ میں پلی سوچ کی صفت انسان کو کھوج، پرکھ، مشاہدے اور تجربے سے باز نہیں رہنے دیتی ہے۔ انسان آگ کو دیوتا مانتا تھا۔ اس نے کھوج کر کے آگ کا ماخذ دریافت کیا۔ مادے سے مادا ٹکرا جائے تو طاقت کے ذرے آوارہ ہو جاتے ہیں۔ اور آگ کی صورت میں نمودار ہو جاتے ہیں۔ انسان نے آگ سے دیوتا کا احساس جھٹلانا شروع کیا۔ انسان چیچک اور دوسری بیماریوں کی

وجوہات سے نا آشنا تھا۔ لیکن تجربوں کی وساطت سے انسان نے چیچک اور بہت ساری بیماریوں کا نام صفحہ ہستی سے مٹا کر رکھ دیا۔ یوں شیتلا دیوی اور ایسے ہی کئی دیوی دیوتاؤں کا احساس مٹانا شروع کیا۔ روزمرہ کے تجربوں، حادثوں، واقعوں کی بُنیاد پر انسان نے کئی مبہم غیر حقیقی یا فرضی توہمات سے چھٹکارا حاصل کر کے نئی منزلوں کی طرف قدم بڑھایا ہے۔

آج انسان سوچ اور منطق کے سہارے ارتقاء کی ایسی منزل پر کھڑا ہے جہاں اُسکو اِس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اگر خدا ہے تو یہ ساری کائنات خُدا ہے جسکا ایک حصہ وہ خود ہے۔ اور کائنات پر حاوی مادے پر مبنی قانون خدائی قانون ہیں۔

خدا کا الگ وجود ہے یا کائنات بذات کُل خُدا ہے۔ اِس مسئلے کا حل وقت ہی پیش کر سکتا ہے۔ اِس مسئلے کو سُلجھانے کیلئے انسان کو کھوج برابر جاری رکھنی ہے۔ کھوج تب ہی ممکن ہے جب کھوج کرنے کیلئے مواد موجود ہو کائنات میں مادے کا بحر بیکراں موجود ہے۔ انسان کے سامنے صرف یہی ایک مواد کھوج کرنے کیلئے میسر ہے۔ اس لئے انسان کو طوعاً کرہاً مادے پر ہی اکتفا کر کے مادے کی حیثیت کو ہی اولین اہمیت دینی ہے۔ مادے کو ہی تختۂ مشق بنا کر خُدا کے وُجود کا مقام تعین کرنا ہے

انسان جب صفحۂ ہستی پر نمودار ہوتا ہے تو اُسکی حالت نوزائیدہ بچے کی ہوتی ہے۔ نہ اُسکے کورے ذہن پر کسی حادثے کی چھاپ ہوتی ہے اور نہ ہی اُسکا کورا ذہن کسی تجربے سے متاثر ہوا ہوتا ہے۔ وہ فقط اپنی حالت کی قوت "ڈھیل" میں جکڑا ہوا ہوتا ہے۔ اُس کی ہر کوشش، ہر جنبش اپنے جسم کی قوت کے طابع ہوتی ہے اور ماحول میں بکھری قوتوں سے نبردِ آزما رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔

انسان کے جسم میں دماغ کے ذروں کی حالت کی ایک صفت ہوتی ہے "بھوک کا احساس" اس لئے انسان پیدا ہوتے ہی اپنی بھوک مٹانے کے لئے ہر شئے مُنہ میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ ماں کا دُودھ پینے کے لئے اُسکو سانس کھینچنے کی قوت استعمال کرنا پڑتی ہے مُنہ میں دودھ بھر کر حلق کی قوت استعمال کر کے دُودھ کو پیٹ کی طرف دھکیلنا پڑتا ہے۔ معدہ قوت استعمال کر کے دودھ کو ہضم کرتا ہے۔ ایسے کئی مرحلوں سے گذر کر دُودھ انسان کے جسم کی قوت بڑھا کر انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ اردگرد ماحول میں سرگرداں قوتوں سے نبردِ آزما ہو کر اپنے جسم کی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جائے۔ جو شئے اُسکے جسم کی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے کے منافی ثابت ہوتی ہے۔ انسان اُس شئے کو قوت صرف کر کے جسم سے خارج کر دیتا ہے۔

خون کی گردش جسم میں بدستور برقرار رکھنے کیلئے پانی کی ضرورت پڑتی ہے تو

اِنسان کو پیاس لگتی ہے۔ اِنسان قوت حسیّ کر کے پانی پی جاتا ہے۔ گرمی لگتی ہے تو یہی پانی پسینے کی شکل میں خارج کر کے بدن کو جھلسنے سے بچا لیتا ہے۔ یوں انسان کا جسم گرمی سے جل کر اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار نہ رکھنے کے خطرے سے بچ جاتا ہے۔

ہر تجربے کے ساتھ ساتھ اِن تجربوں سے اخذ کئے گئے نتیجے دماغ کے خلیوں (cells) یا دماغ کے مادے کے ذروں کی حالت میں مُقید ہو جاتے ہیں۔ جسکو دماغ کی مخصوص صفت سوچ، حسبِ ضرورت، یاداشت کی صورت میں استعمال کرتی ہے۔ اِس لئے اِنسان کو ایک ہی تجربہ بار بار دُہرانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یاداشت کی مقدار علم کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے اور دماغ میں مادے کے ذروں کی حالت پر منحصر رہتی ہے۔

بھوک کا احساس اِنسان کو خوراک حاصل کرنے پر اُکساتا ہے۔ دیکھنے کی صفت اُسکو درخت کے نیچے ٹپکے پھل سے آگاہ کرتی ہے۔ سوچ کی صفت اُسکے ہاتھ پیروں کو پھل اُٹھانے پر مجبور کرتی ہے۔ اِنسان پھل اُٹھا کے بھوک کے احساس کے زیر اثر منہ میں ڈال دیتا ہے۔ اِنسان کی بھوک مٹ جاتی ہے۔ اِس تجربے کی چھاپ اِنسان کے دماغ کے خلیوں (cells) یا مادے کے ذروں میں منتقش ہو جاتی ہے۔ اِنسان کا علم بڑھ جاتا ہے۔ ابکے اِنسان بے روک ٹوک دوسرے پھل کا حدود بذریعہ سوچ کر کے پھل اُٹھا کر منہ میں ڈالتا ہے۔ پھل سڑا ہوا ہوتا ہے۔ اِنسان کا منہ

پھسلنے لگتا ہے۔ دماغ میں اعصاب کے ذریعے خبر پہنچ جاتی ہے۔ بدن کی ہر صفت، بدن کی حالت بدستور برقرار نہ رہنے کا خطرہ محسوس کرتی ہے۔ دماغ منہ کو حکم دیتا ہے منہ طاقت استعمال کر کے پھل کو اُگل دیتا ہے۔ انسان کے دماغ میں ایک اور تجربے کی چھاپ "خلیوں" میں مقید ہو جاتی ہے۔ وہ سڑے پھل کھانے سے پرہیز کرتا ہے ذہن میں سڑے اور اچھے پھل کی تمیز جنم لیتی ہے۔

اِن تجربوں کی بنا پر انسان کے ذہن میں پاک اور ناپاک یا شُدھ اور اشُدھ کی پرکھ وجود میں آگئی۔ جس خوراک سے انسان کی مخصوص حالت بدستور برقرار رہ سکتی ہے۔ اُس خوراک کو انسان نے پاک یا شُدھ کا درجہ دیدیا۔ اور جس خوراک سے انسان کی حالت بدستور برقرار نہیں رہ سکتی اُس خوراک کو ناپاک یا اشُدھ کے زمرے میں شامل کر دیا۔

انسان قے (منہ سے اُگلی چیز) کو ناپاک سمجھتا ہے۔ کیونکہ قے میں تھوک اور جراثیم کی موجودگی انسان کی حالت بدستور برقرار رکھنے کیلئے منافی ہے۔ لیکن شہد کی مکھی کی قے "شہد" پاک چیز مان لی جاتی ہے۔ شہد میٹھا اور طاقتور ثابت ہوا ہے۔ اور انسان کی حالت بدستور برقرار رکھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ انسان گائے بکری کا پیشاب استعمال نہیں کرتا کیونکہ پیشاب کو اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے کے منافی سمجھتا لیکن گائے بکری کا دودھ استعمال کرتا ہے کیوں کہ دودھ انسان کی حالت بدستور برقرار رکھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے جب کہ دونوں چیزیں گائے بکری کے بدن سے حاصل ہوتی ہیں۔

اپنے بدن کی حالت بدستور برقرار رکھنے کیلئے انسان زہر (جو انسان کی حالت کو بدستور رکھنے کے منافی ہے) کو ناپاک کا درجہ دیتا ہے لیکن اسی زہر کو بیماری کی حالت میں اپنے بدن کی حالت بدستور برقرار رکھنے کے خاطر دوائی سمجھ کر استعمال کرتا ہے اور زہر کو پاک کا درجہ عطا کرتا ہے۔

غرضیکہ پاک اور ناپاک یا شدھ اور اشدھ جذبوں کی تفریق کے پیچھے انسان کو صرف اپنے مخصوص وجود کی برقراری کا جذبہ حامل ہے۔ چونکہ پاک اور ناپاک جذبوں کا ارتقاء مادے کی مختلف صورتوں اور صفات کا اثر انسانی جسم پر ہونے سے منسلک ہے۔ اس لئے ان جذبوں کو مادے کی صفات کو نظر انداز کر کے گڑھ لیا جائے تو غلط ہے اور غیر فطری ہے۔

تجربے ہوتے رہے۔ مشاہدے ہوتے رہے اور انسان اس منزل تک آپہنچا۔ جہاں وہ درخت سے ٹپکے پھل حاصل کرنے کے بجائے درخت پر پتھر مار کر پھل درخت سے گرانے کے مرحلے تک پہنچا۔ لگاتار پتھر مارنے کی حرکت سے وہ نشانہ لگانے میں ماہر ہو گیا۔ انسان کے ذہن میں توازن اور اندازے کا تصور ابھر آیا۔ پتھر مار کر پھل گر جاتا تھا اور انسان کی بھوک مٹ جاتی تھی۔ ایک انسان کے تجربے کو اندازے کی کسوٹی پر پرکھ کر ہر انسان پتھر مار کر پھل گرانے لگا اور سب انسانوں کی عید ہو گئی۔

بازوؤں کی کمزوری یا نظر کی کمزوری نے اندازہ غلط کر دیا، نشانہ چوک گیا۔ پتھر پھل کو نہ گرا سکا۔ لیکن دوسرے اِنسان کے سر پر آ گرا۔ دوسرے اِنسان کا سر پھٹ گیا۔ دوسرے انسان کے سر کی مخصوص حالت بدستور برقرار نہیں رہی۔ بدن کی سب صفات میں انتشار پیدا ہو گیا اور درد کی صورت میں نمودار ہو گیا۔ درد کا مآخذ ڈھونڈ ملنے پر دوسرے اِنسان کی سوچ اُبل پڑی۔ نظر اور اندازے کی صفات نے اُس پر جتا دیا کہ پہلے انسان کا پتھر اُس کے سر سے ٹکرایا۔ وہ بھی پہلے انسان کے سر پر پتھر مارے تو شاید پہلے انسان کے سر کی حالت بھی درد میں مبتلا ہو جائے گی۔ کھوج کی صفت نے دوسرے اِنسان کو اُکسایا اور دوسرے انسان نے پتھر پھل پر مارنے کے بجائے پہلے اِنسان کے سر پر براہ راست دے مارا۔ پہلا انسان پتھر سر سے ٹکرانے کی محرکات سے نا آشنا تھا۔ وہ پتھر کو اپنی طرف آتے دیکھ کر بھی اپنے سر کو نہیں بچاتا حتےٰ کہ پتھر اُس کے سر سے ٹکرا گیا۔ وہ بھی درد میں مبتلا ہو گیا۔ تب اُسکی سوچ مُتحرک ہو گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ پتھر لگنے سے سر میں چوٹ لگتی ہے۔ اور سر جو بدن کا ایک حصہ ہوتا ہے اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ دوسرا اِنسان پتھر پر پتھر مارتا جائے تو سر کے ساتھ ساتھ اُس کے سارے جسم کی حالت بدستور برقرار رکھنے سے قاصر ہو جائے گی۔ اِس لئے اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے کی خاطر

پہلا انسان دوسرے انسان کو سمجھاتا ہے کہ ایکدوسرے پر پتھر مارنے کی صورت میں دونوں

انسان اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار نہیں رکھ سکتے۔ دوسرا انسان بھی اسی سوچ کے زیر اثر راضی ہو جاتا ہے۔ اصل میں کوئی کسی پر احسان نہیں کرتا۔ دونوں اپنا آپ بچانے کے لئے یا اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے کیلئے آپسمیں رابطہ قائم کرتے ہیں۔ یہ رابطہ انسان کے رسل و رسائل کی پہلی کڑی بن گئی اور ایکدوسرے کو پتھر مارنا، زک پہنچانا یا ایک دوسرے کی مخصوص حالت کو خطرے سے دوچار کرنا گناہ کا درجہ حاصل کر گیا۔ پاپ کا درجہ حاصل کر گیا۔

دو انسانوں نے دو پھل دیکھ لئے۔ دونوں انسانوں نے خوراک حاصل کرنے کی غرض سے دوڑ لگائی۔ ایک انسان پہلے پہنچ گیا۔ اُس نے دونوں پھل دو ہاتھوں میں اُٹھا لئے۔ دوسرا انسان خالی ہاتھ تکتا رہ گیا۔ پہلے انسان کی بھوک ایک ہی پھل کھانے سے مٹ گئی۔ اندازے کی حس نے پہلے انسان پر جتا دیا کہ دوسرا انسان بھی پھل حاصل کرنے کے لئے دوڑ پڑا تھا چونکہ پہلے انسان کی بھوک مٹ گئی تھی اور اس لئے دوسرے پھل کی ضرورت نہ تھی۔ اُس نے دوسرا پھل دوسرے انسان کی طرف پھینک دیا۔ دوسرے انسان نے دوسرا پھل اُٹھا کے کھا لیا۔ اُس کی بھوک بھی مٹ گئی۔ پہلے انسان کی معصوم سی حرکت (پھل پھینکنے کی حرکت) سے دوسرے انسان کا پیٹ بھر گیا اور اُس کی حالت بدستور برقرار رہی۔ دوسرا انسان بھی یادداشت کی حس کے سہارے پہلے انسان کی تقلید کر کے نئے پھل دوسرے انسانوں میں بانٹنے

لگا۔ جو پھل نہ ملنے کی صورت میں بھوک نہیں مٹا سکتے تھے اور اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے سے عاری رہ جاتے۔ یوں انسان نے اپنی اور اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے کی خاطر اس قسم کی حرکتیں اپنانا شروع کیں جو ثواب یا نیکی کا عنوان اختیار کرتی گئیں۔ بیماری یا کمزوری کی حالت میں مبتلا، یا کسی اور وجہ سے خوراک حاصل نہ کرنے کی صورت میں ایک انسان کو دوسرے انسان کی شرکت سے اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے میں مدد ملنے لگی۔

جسم میں کانٹے چبھتے رہتے ہیں۔ کانٹا نکالنے کیلئے جسم کی چیر پھاڑ ضروری ہے۔ گو جسم کی حالت بدلنے یا جسم کو تکلیف دینے کا عمل گناہ کہلاتا ہے۔ لیکن جسم کی مجموعی حالت بدستور برقرار رکھنے کیلئے ایسا عمل ثواب کے زمرے میں شامل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کی چیر پھاڑ کو گناہ کا درجہ نہیں دیا جاتا ہے۔ چاہئے انسان اس عمل کے دوران مر بھی جاتے کیونکہ ڈاکٹر کی چیر پھاڑ کا عمل جسم کی مجموعی حالت بدستور برقرار رکھنے کے جذبے کے تحت کرتا ہے۔ جبکہ قاتل کی چیر پھاڑ گناہ کا درجہ اختیار کرتی ہے۔ کیونکہ قاتل کی چیر پھاڑ جسم کی مجموعی حالت بدستور نہ رکھنے کے جذبے کا عمل ہوتا ہے۔ خودکشی کے فعل کو اسی لئے گناہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ خودکشی انسان کی حالت بدستور برقرار نہ رکھنے کے جذبے کے تحت کی جاتی ہے!

گناہ اور ثواب، پاک اور ناپاک ایسے بنیادی جذبے [illegible] انسان نے

مذہب کی عمارت کھڑی کی ہے۔ لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ مختلف مذاہب نے پاک ناپاک اور گناہ ثواب کے جذبوں کو مادے کی حقیقی صفات سے مُبرّا رکھ کر فرضی معنی پہنا دئے ہیں۔ اِنسان اِن مصنوعی بھول بھلیوں میں بھٹک کر صحیح جذبوں کی حقیقت، اِرتقاء اور رد و عمل سے ناآشنا ہو رہا ہے۔ اور ہر مذہب ڈھونگ یا سوانگ کی شکل اختیار کرتا جاتا ہے۔

ایک مذہب کچھ حرکات کو گناہ کا درجہ عطا کرتا ہے جبکہ ایسی حرکات دوسرے مذہب میں ثواب کا درجہ رکھتی ہیں۔ ایک مذہب میں گوشت خوری گناہ سمجھی جاتی ہے جبکہ دوسرے مذہب میں ثواب سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ دونوں مذاہب کے اِنسان دونوں صورتوں (گوشت کھانے اور گوشت نہ کھانے) میں اپنی حالت بدستور برقرار رکھ سکتے ہیں۔ ساری کائنات میں انسان کی جنس ایک ہے۔ اِس لئے جو شے کسی مذہب کے انسان کے لئے پاک یا ناپاک ثابت ہوگی وہ ہر مذہب کے اِنسان کے لئے پاک یا ناپاک ثابت ہوگی۔ یوں زہر ہر مذہب کے انسان کیلئے مضر ہے اور ناپاک کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے استعمال سے ہر مذہب کا اِنسان اپنے جسم کی مخصوص حالت بدستور برقرار نہیں رکھ پاتا۔

اِنسان بھیڑ کو مارتا ہے تاکہ اپنی خوراک پوری کرکے اپنے جسم کی حالت بدستور برقرار رکھ سکے اور اس لئے قاتل نہیں کہلاتا۔ اُس کا یہ فعل غیر جنس (بھیڑ) پر ہوتا ہے۔

جبکہ یہی اِنسان خوراک حاصل کرنے کے لئے بھیڑ کے بجائے کسی اور اِنسان کو مارے تو قاتل کہلاتا ہے۔

پہلی حالت میں اِنسان غیر جنس کو مار کر اپنے جنس کی آبیاری کرتا ہے اور دوسری حالت میں اِنسان اپنی ہی جنس کو زک پہنچاتا ہے۔ دوسری حالت میں اِس عمل کو گناہ کا درجہ نہ دیا جائے تو ہر اِنسان دوسرے اِنسان کے ایسے عمل سے اپنے وجود کو خطرے سے دوچار پاتا ہے۔ اِس لئے اِنسان کو ایسی حرکات سے پرہیز کروانے کے لئے سزا (انسان کی مخصوص حالت کو بدستور برقرار نہ رکھنے کا عمل جیسے پھانسی، چیر پھاڑ، مار پیٹ، بھوک پیاس وغیرہ) کا احساس دیا جاتا ہے تاکہ ہر اِنسان سزا سے بچنے کے لئے (اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے) ایسے عملات سے پرہیز کرے اور دوسرے اِنسان کی حالت کیلئے خطرناک ثابت نہ ہو۔

رسل و رسائل کے اِرتقاء نے اِنسان کو اِنسان کے قریب کر دیا لیکن کائینات کی کسی دوسری جنس (species) سے اُسکا رابطہ نہ بن سکا۔ نہ اِشاروں سے، نہ بات چیت سے، نہ لکھائی پڑھائی سے۔ کیونکہ ایک جنس کی حالت دوسری جنس کی حالت سے مختلف ہوتی ہے۔ ساخت مختلف ہوتی ہے، صورت مختلف ہوتی ہے۔ صفات مختلف ہوتی ہیں۔ اسی لئے کتنے ہی قانون

بنلئے جائیں۔ کتنے ہی اخلاقی حربے تجویز کئے جائیں۔ کتنی ہی سزائیں مقرر کی جائیں۔ کسی دوسری جنس پر اِنکا اطلاق ممکن نہیں۔ گائے، شیر، بھیڑ، بھیڑیا، کتا، مچھلی، پرندے، جانور، درندے۔ غرضیکہ ہر ایک جنس دوسری جنس کے اصولوں، سزاؤں یا سوچ کو اپنی حالت پر تسلیم کرنے سے عاری ہے۔ اور ویسے ہی آپسمیں برسرِ پیکار ہیں، جیسے ارتقاء کے اولین لمحے میں تھے۔ شیر اب بھی اِنسان، بھیڑ، بکری کو اپنی خوراک سمجھتا ہے جیسے صدیوں پہلے سمجھتا تھا۔ اور اِنسان اب بھی گوشت، مچھلی، گیہوں، پھل کو اپنی خوراک سمجھتا ہے جیسے اِرتقاء کی پہلی سیڑھی پر سمجھتا تھا۔

گناہ ثواب اور پاک ناپاک جذبوں کا وجود اِنسان اور صرف اِنسانی جنس کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ اِنسان کے جسم میں دماغ کے مادے کے ذرّوں کی مخصوص پیداوار ہیں۔ جو کائینات کی کسی دوسری جنس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے اور انکے لئے کائینات کی اٹل حقیقتیں نہیں۔

اِنسان نے درخت کو کھڑا دیکھا اور درخت کو کھڑا دیکھتا رہا۔ اِنسان نے درخت کو گرتے نہیں دیکھا تھا۔ اِنسان گرتے درخت میں متحرک قوت سے ناآشنا تھا۔ اِس لئے اِنسان کا ذہن درخت گرنے کا اثر قبول نہ کر پایا تھا۔ گرتے درخت کی زد اُسکے اُوپر تھی۔ درخت گر گیا اور اِنسان زخمی ہو گیا۔ اِنسان کی مخصوص

حالت بدستور برقرار نہ رہ پائی۔ اِس تجربے سے اِنسان کے ذہن نے درخت گرنے کا اثر قبول کر لیا گو اِنسان درخت گرنے کے محرکات سے نابلد تھا۔ ہر کھڑے درخت کو دیکھ کر اِنسان کے ذہن میں یادداشت کی صِفت ایسا اثر اُبھارتی تھی۔ اِسلئے اِنسان اپنے بدن کی حالت بدستور برقرار رکھنے کی خاطر، ہر کھڑے درخت سے کترانے لگا۔ دماغ میں درخت سے دور رہنے کی حِس وجود میں آگئی۔ آہستہ آہستہ اِنسان ہر اُس چیز یا شئے سے دُور رہنے کی کوشش کرنے لگا جو اِنسان کی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے کے منافی ثابت ہوئی۔ اِس احساس کو اِنسان نے ڈر اور خوف کی کیفیات سے منسوب کیا۔ وہ آگ سے ڈرنے لگا کیونکہ آگ کی حقیقت سے نا آشنا تھا۔ پانی سے ڈرنے لگا کیونکہ پانی کی حقیقت سے نا آشنا تھا۔ بھونچال سے ڈرنے لگا کیونکہ بھونچال کی حقیقت سے نا آشنا تھا۔

سانپ اندھیری جگہوں میں رہتے ہیں۔ اِنسان اندھیری جگہ میں قدم بڑھاتا تھا تو ڈسا جاتا تھا۔ اِنسان نے اندھیری جگہ کو سانپ سے مُتعلک کر دیا۔ اندھیری جگہ کو دیکھ کر یادداشت کی صِفت اُسکے ذہن میں سانپ کی موجودگی کا احساس جگاتی ہے۔ اور اِنسان سانپ کی غیر موجودگی میں بھی اندھیری جگہ میں قدم بڑھانے سے احتراز کرنے لگتا ہے۔ یوں اِنسان کے ذہن میں اندھیرے کے تئیں خوف نے جنم لیا۔ اندھیری جگہ میں اِنسان کی نگاہ بے بس ہے۔ اِنسان

اندھیری جگہ میں دیکھ نہیں سکتا ہے۔ نہ دیکھنے کی وجہ سے اندھیری جگہ کی کھوج نہیں کر سکتا ہے۔ دھیرے دھیرے اِنسان ہر اُس جگہ سے، واقعے سے، حادثے سے ڈرنے لگا جس کی کھوج اُسکی پہنچ سے باہر ہے۔ اور جس کی حقیقی حالت سے وہ لاعلم ہوتا ہے۔ اِنسان نے ایسے واقعوں، حادثوں، جگہوں کو نامعلوم (unknown) سے منسوب کیا۔

انسان مر جاتا ہے۔ مر کر اِنسان کا جسم بالکل بدل جاتا ہے اِس لئے مرنے کا عمل اِنسان کے ذہن میں ڈر پیدا کرنے لگا۔ گرتے درخت سے اِنسان بھاگ سکتا ہے۔ اندھیروں سے دُور رہ سکتا ہے۔ درندوں سے لڑ سکتا ہے۔ طوفانوں سے ٹکرا سکتا ہے لیکن موت کے اندھیروں سے چھٹکارہ نہیں پا سکتا۔ جلد یا بدیر ہر اِنسان نے اِن اندھیروں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر شئے اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے کی کتنی بھی سعی کرے لیکن ابد تک اپنی حالت بدستور برقرار نہیں رکھ پاتی۔ کائنات کی ہر قوت، ہر لمحہ اُس چیز کی حالت بدلنے کی سعی کرتی رہتی ہے۔ مر کر اِنسان نہ معلوم کیسے اندھیروں سے دوچار ہو! اِنسان کی سمجھ سے ابھی بالاتر تھا۔ ابھی اِنسان کو مادے کی صِفات اور ماہیت کی پوری جانکاری نہ تھی۔ اِس لئے اپنے ذہن میں مرنے کے تئیں ڈر کی حِس کو جھٹلانے کی خاطر اِنسان نے دوسری دنیا کا خیالی پیکر گڑھ لیا۔ خیالی اِس لئے کہ کوئی بھی

انسان مر کر زندہ نہیں ہوتا ہے تاکہ دوسری دنیا کی صداقت کی تصدیق کر سکے لیکن انسان نے ذہن کی قوت نے خیالی دنیا کی تصویر اتنے جاذب پیرائے میں قلمبند کی ہے کہ کم علم انسان موت کے بعد کی زندگی میں یقین رکھتا ہے۔

انسان نے خیالی دنیا کو دو حصوں میں بانٹ کے رکھ دیا۔ پاک اور ثواب کے جذبوں کے تحت جنت کی تعمیر کی اور ناپاک و گناہ کے جذبوں کو جہنم سے منسلک کر دیا۔ یوں انسان نے دو مقصد پورے کر لئے۔ ایک تو انسان موت کے تئیں ڈر کو ذہن سے زائل کر کے بے فکر ہو کر اپنی حالت کو بدستور برقرار رکھنے کی حرکات میں جُٹا رہا۔ دوسرے جہنم اور جنت کو مختلف معنی پہنا کر اپنے جسم کی حالت دوسرے انسانوں کی دسترس سے بدستور برقرار رکھنے کی سبیل بھی ڈھونڈلی۔ جہنم کا خوف دے کر انسان کو گناہ اور ناپاکی سے باز رکھنا چاہا اور پاک اور ثواب کے جذبوں کی آبیاری کرنے کیلئے جنت کی ترغیب دے دی۔ تاکہ اپنی حالت بدستور برقرار رکھ سکے۔

جہنم میں ایسی اشیاء میسر ہونے کی تصویر کشی کی جو مادے سے بنے انسان کے جسم کی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے کے منافی ثابت ہوئی ہیں۔ جیسے:- آگ، مار پیٹ، زہر، دھواں، شور و شر، خوفناک ماحول، خوفناک درندے اندھیرا وغیرہ۔ ......

جنت میں ایسی اشیاء میسر ہونے کی تصویر کشی کی جو مادے سے بنے انسان کے جسم کی

حالت بدستور برقرار رکھنے کی حامل ثابت ہوئی ہیں۔ جیسے پھل پھول، شہد کی ندیاں، دودھ کے تالاب، مکان محل، خوبصورت مناظر، آرام دہ مناظر، ناچ گانا... روشنی وغیرہ

جہنم کے لوازمات جیسے آگ، بھوک، زہر، دھواں، خوفناک درندے وغیرہ اور جنت کے لوازمات جیسے پھل پھول، شہد، دودھ، مکان محل، روشنی وغیرہ آپ مادے کے مختلف صورتیں ہیں۔ دوسری دنیا میں مادے کا تصور دنیا (جبکہ موت کے بعد انسان کی روح مادے سے مبرا سمجھی جاتی ہے) دوسری دنیا کا مذاق اُڑانا ہے۔

غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر مذہب کا انسان اپنے مذہب کو خدا کی طرف سے نازل مذہب سمجھتا ہے اور اپنے مذہب کو اصلی خدائی مذہب سمجھتا ہے۔ خدا جو کل کائنات میں واحد مانا جاتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ واحد خدا نے ارتقاء کے مختلف مرحلوں پر مختلف مذاہب نازل کئے۔ کیا وجہ ہے کہ واحد زمین پر مختلف خطوں میں مختلف مذہب نازل کئے۔ کیا وجہ ہے کہ مختلف مذہب واحد خدا کی واحد زبان میں نازل ہونے کے بجائے مختلف خطوں میں رائج مختلف زبانوں کے سہارے نازل کئے۔ کیا وجہ ہے کہ مذہب صرف انسان کی جنس پر نازل کیا۔ چرند، پرند، درندوں، جانوروں پر نہیں۔ جبکہ چرند، پرند، درندے، جانور سب خدا کی مخلوق ہیں۔؟

اِنسان کا وجود کسی طور صفحہ ہستی سے مٹ بھی جائے تب بھی مادے کی اور جمادات مثلاً پہاڑ، ہوا، پانی، چاند، ستارے، اور جانداروں کی اور جنس مثلاً درندے، پرندے، پیڑ پودے موجود رہینگے۔ اِنسان نہیں رہیگا۔ انسان کی مخصوص سوچ نہیں رہیگی۔ نہ روح کا تصور رہیگا۔ نہ جنت جہنم کا تصور رہیگا۔ نہ مذہب کا تصور رہیگا اور نہ ہی خدا کا تصور رہیگا۔ لیکن کائینات کے قانون، مادے کی ہیئت، مادے کی خاصیت بدستور برقرار رہیگی۔ چاند پر اِنسان نہیں لیکن مادا ہے اور مادے کی مخصوص صفات رواں دواں ہیں۔

ہر شئے اپنے ماحول کی پابند ہے۔ اِنسان مادے کے ماحول کا پابند ہے۔ اِس لئے اِنسان کو کم علم اور غلط اصولوں پر مبنی مذاہب کو چھوڑ کر کائینات کے اصلی علم کا اطلاق کر کے ایک ایسے لائحہ عمل کی تشکیل کرنا ہوگی جو ساری اِنسانی جنس کی آبیاری کرلے۔ چونکہ یہ لائحہ عمل اِنسان کے جنس سے وابستہ ہوگا اِس لئے یہ لائحہ عمل انسانیت کہلائیگا اور صرف مادے کے اٹل اصولوں، قانونوں پر قائم ہو سکتا ہے۔

تجربوں، مشاہدوں اور کھوج سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ کائینات میں ہر شئے اپنی حالت (state) بدستور برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے کے خاطر اردگرد ماحول میں بکھری

دوسری اشیاء کی حالت بدستور برقرار نہیں رہنے دیتی۔ طوفان اپنی تیزی برقرار رکھنے کے لئے پیڑوں، پودوں، پہاڑوں کی حالت بدل دیتا ہے سیلاب بہاؤ کی حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے زمین، مٹی کی حالت بدل دیتا ہے غور سے مشاہدہ کیا جائے تو ہر تغیر تبدل میں یہی راز پنہاں ملتا ہے۔

اِنسان بھی اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے پھل کی حالت بدل کر بھوک مٹا دیتا ہے۔ خوراک کھاتا ہے تو خوراک کی حالت بدل دیتا ہے۔ سانس لیتا ہے تو ہوا کی حالت بدل دیتا ہے۔ لیکن اِنسان کے طریقہ کار اور طوفان سیلاب کے طریقہ کار میں نُمایاں فرق مِلتا ہے۔

طوفان اپنی تیزی کی حالت بدستور برقرار رکھنے کی خاطر درخت، پیڑ، پہاڑ کی حالت ضرور بدل دیتا ہے لیکن پیڑ پہاڑ کی حالت بدل کر اپنا حجم، مقدار یا تیزی کو بڑھا نہیں پاتا۔ یوں سیلاب بھی اپنے بہاؤ کی حالت برقرار رکھنے کے لئے زمین، مٹی کی حالت ضرور بدل دیتا ہے لیکن مٹی، زمین کی حالت بدل کر اپنا حجم، مِقدار یا تیزی میں اضافہ نہیں کر پاتا۔

اِس کے برعکس اِنسان پھل، پانی، ہوا کی حالت بدلنے کے عمل کو اِستعمال کر کے اپنی حالت کو بدستور برقرار رکھنے کی قوت میں اضافہ کرتا ہے۔ خوراک کی حالت بدل کر اپنے جسم کی نشو نما کرتا ہے اپنا حجم بڑھاتا ہے۔ اپنی مقدار بڑھاتا ہے۔ اپنی

قوت بڑھاتا ہے۔ یہ صفت کائینات کی کچھ اشیاء میں مادے کے ذروں کی مخصوص حالت ([illegible]) میں ہونے کی وجہ سے رونما ہوتی ہے۔ اِس صفت کو زندگی کی صفت کا نام دیا گیا ہے۔ اور جس مادے کی صورت میں یہ صفت رونما ہوتی ہے اُن اشیاء یا مادے کی صورتوں کو زندگی کی صفت سے آراستہ سمجھا جاتا ہے۔ یا ایسی اشیاء زندہ سمجھی جاتی ہیں۔ زندہ اشیاء کی ایک انوکھی صفت یہ بھی ہوتی ہے کہ اور اشیاء کی حالت بدل کر، اِن اشیاء کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی جنس کی آبیاری کرتی ہیں۔ اپنی جنس کو بڑھاوا دیتی ہیں۔

ایک ننھا سا بیج، مٹی کی حالت بدل کر، مٹی کو ہضم کر کے، پانی اور ہوا کو جذب کر کے تناور درخت بن جاتا ہے۔ اپنے جنس کی آبیاری کرنے کے لئے ہزاروں بیج پیدا کرتا ہے۔ جو ہزاروں تناور درخت بن جاتے ہیں۔ درخت کو زندگی کی صفت سے آراستہ سمجھا جاتا ہے۔ کیڑا انڈے سے پیدا ہوتا ہے۔ اِرد گرد مادے کی مختلف صورتوں کو ہضم کر کے یا اُن کی حالت بدل کر ہزاروں اور انڈے پیدا کرتا ہے۔ ہر انڈا ایک نئے کیڑے کو جنم دیتا ہے۔ کیڑا زندہ کہلاتا ہے۔

اِنسان خوراک کھاتا ہے۔ پانی ہوا کی حالت بدل کر اور نئے اِنسانوں کو جنم دیتا ہے۔ اِنسان زندہ کہلاتا ہے۔

اِنسان بچے کو جنم دیتا ہے تو سوچنے کی صفت اِنسان کو اِس حاشیے کا ماخذ

ڈھونڈھنے پر اُکساتی ہے۔ اِنسان کھوج اور مشاہدہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے
اُس پر واضح ہو جاتا ہے کہ وہ خود بھی کبھی اِس ننھے مُنے کمزور معصوم بچے کی طرح
وجود میں آگیا ہو گا۔ اور اپنی مُنحنی سی حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے اِس بے آسرا
بچے کی طرح ہاتھ پیر مارتا رہا ہو گا۔ کائینات میں سرگردان قوتیں اِس چھوٹے سی قوت
کی حالت پر حاوی ہو کر اِسکے وجود کو برقرار رہنے نہیں دیتیں۔ لیکن اِنسان نے
اِس بچے کی مدد کر کے اِسکی حالت بدستور برقرار رکھنے کی سعی کی ہو گی۔ ورنہ وہ
خود اِس حالت میں بدستور برقرار نہ ہوتا۔ نتیجہ اخذ ہوا۔ اِنسان نئے اِنسان کو
جنم دے کر نئے اِنسان کی حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے مدد پر آمادہ رہتا ہے۔

زندگی کی صِفات گِننے سے گِنی نہیں جاتیں۔ تجربے اور مشاہدوں سے ایک
ایک کر کے عیاں ہو جاتی ہیں۔ اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے اِنسان کو
بھوک محسوس ہوتی ہے۔ خوراک حاصل کرنے کے لئے دیکھنے، سُننے، سُونگھنے اور
چھُونے کی قوت عطا کرتی ہے۔ وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ ہی اُس کے کمزور وجود
کے لئے غذا میسر رکھتی ہے۔

بیج کے اردگرد گودے کا خول بیج کی غذا ہوتی ہے۔ اور تب تک کیلئے
کافی ہوتی ہے۔ جب تک کمزور بیج پھل پھول کر اِس قابل نہیں ہو جاتا ہے کہ براہِ راست
کائینات کی قوتوں سے برسرِ پیکار ہو کر اپنے لئے غذا میسر کر سکے۔ انڈے کی سفیدی

انڈے میں پنہاں جاندار کی غذا تب تک کے لئے میسر رہتی ہے۔ جب تک جاندار اس قابل نہیں بن جاتا کہ براہ راست کائنات کی قوتوں سے برسرپیکار ہو کر اپنے لئے غذا میسر کر سکے۔

بچہ تولد ہوتے ہی ماں کے پستان غذا سے پُر رہتے ہیں جو جنم دینے والے کی وساطت سے نئی زندگی کو تب تک میسر رہتا ہے۔ جب تک نئی زندگی اس قابل نہ ہو کہ خود اپنی غذا حاصل کر کے اپنی صورت یا دستور برقرار رکھنے کے قابل ہو جائے۔

تولید کے مرحلے سے ماں اور بچے کا ساتھ غذا کی ضرورت کے پیش نظر شروع ہو جاتا ہے۔ چونکہ انسان کا دماغ تناسب کے لحاظ سے باقی سب جانداروں سے بڑا ہوتا ہے۔ انسان کی قوتِ یاداشت بھی بدرجہ اُتم ہوتی ہے اور بہت دیر تک قائم رہتی ہے۔ اس لئے انسانی جنس میں ماں بچے کا ساتھ بہت دیر تک قائم رہتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں ماں بچے کے درمیان پیار، محبت، ماتا کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔

دراصل پیار، محبت، ماتا ضرورت کی پیداوار ہے۔ بیوی اور خاوند کا پیار جنسی ضرورت کی پیداوار ہے۔ جنسی خواہشات کی تکمیل نہ ہو یا جنسی خواہشات کی ضرورت پوری نہ ہو تو خاوند بیوی کا پیار ٹوٹ جاتا ہے۔ بہن بھائیوں کی محبت ایک دوسرے کے کھیل کود، میل ملاپ پر منحصر رہتی ہے۔ کھلونوں، کھیل کود یا جائیداد کے پیسے پیسے پر جھگڑا ہو جائے تو بھائی بھائی سے جدا ہو جاتا ہے۔

بہن بھائی کا پیار ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک ہی سوچ اور سمجھ کے دھارے کے تحت انسان دوستی، برادری، مذہبی اور ایسے ہی کئی اور رشتوں میں بندھ جاتے ہیں۔ سوچ متضاد ہوگی تو دوستی، برادری پروان نہیں چڑھتی۔

جن جانداروں کا دماغ جتنا کم ہوتا ہے ان میں اسی تناسب سے ماں بچے کا ساتھ اور مامتا محبت کی مقدار رہتی ہے۔ پرندوں، درندوں میں ماں بچوں کا ساتھ دماغ کے تناسب کے لحاظ سے کم رہتا ہے۔ کیڑے مکوڑوں اور پیڑ پودوں میں دماغ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ اس لئے بیج یا انڈے دینے کے ساتھ ہی والدین اور بچے کا ساتھ چھوٹ جاتا ہے۔ اور مادے کی جن صورتوں میں ذرّوں کی حالت دماغ کے ذروں کی صورت میں موجود نہیں ہوتی۔ اُن میں پیار، محبت، مامتا، دوستی اور ایسے ہی دوسرے جذبے سرے سے ہی مفقود ملتے ہیں۔

ایک انسان اور دوسرے انسان کا ساتھ ایک دوسرے کی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے کی غرض سے ضرورت بن گیا۔ بچے کو ماں سے غذا کی ضرورت پوری کرنے کی وجہ سے ساتھ بن گیا۔ ماں انسانی جنس برقرار رکھنے کے لئے بچے سے وابستہ رہی۔ اور یوں ماں بچے کا رشتہ وجود میں آیا۔ جسے مامتا کے لطیف نام سے نوازا گیا ہے۔ دراصل مامتا کوئی روحانی یا آفاقی جذبہ نہیں۔ ہوتا! تو بچے کی موت پر ہر ماں بچے کے ساتھ ہی اپنی جان بھی دے دیتی۔ روتی ہے پیٹتی ہے۔

بال نوچتی ہے۔ بیوں کرتی ہے۔ لیکن اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھتی

ہے۔ اور زندہ رہتی ہے۔

باپ بچے سے بے نیاز تھا۔ بچہ باپ کے بدن [illegible]

بلکہ باپ کی غیر موجودگی میں بھی جنم لیتا ہے۔ اس لئے غذا کی ضرورت کے پیش نظر

بھی ساتھ نہیں ہوتا۔ لیکن جنسی خواہشات یا صفت ہر جاندار شئے کی مخصوص

صفت ہوتی ہے۔ یہ صفت آدمی کو عورت سے دور نہیں رہنے دیتی۔ عورت بھی جنسی

خواہشات کی تکمیل کے لئے آدمی سے بندھی رہی۔ یوں خاندان (Comune)

وجود میں آگیا۔

کسی انسان نے چچیری بہن کو حقیقی بہن کا رتبہ دیا اور کسی دوسرے

انسان نے چچیری بہن کا رشتہ ہونے کے باوجود بیوی کا درجہ بھی دیدیا۔ پرانے

زمانے میں روم اور مصر کے ملکوں میں بہن بھائی کی شادی جائز قرار دی جاتی تھی۔

کہتے ہیں حوا اور آدم جب زمین پر نازل ہوئے تو واحد تھے۔ اُن کے بہت سے بچے

تولد ہوئے۔ جو آپس میں سگے بہن بھائی تھے۔ بہت بھائی تولید کے رشتے میں

بندھ گئے۔ اور حضرت آدم کی جنس دنیا میں پھلی پھولی۔

یوں ثابت ہوتا ہے کہ بہن بھائی کا رشتہ اضافی ہے اور انسانی ذہن

کی وقتی پیداوار ہے۔ ماں بیٹے کا رشتہ ... وجود میں آگیا

اِس لئے اضافی ہے۔ خاوند بیوی کا رشتہ جنسی خواہشات کی تکمیل کے پیشِ نظر وجود میں آیا۔ اِس لئے اضافی ہے۔

ماں بیٹا، باپ بیٹی یا بہن بھائی تولید کے رشتے میں منسلک ہو سکتے ہیں یہ فعل غیر قدرتی نہیں۔ غیر قدرتی ہوتا تو ایسے مِلاپ سے اِنسانی جنس وجود میں نہیں آتی۔ ایک اِنسان چاہیئے باپ ہو، بیٹا ہو، ماں ہو، بیٹی ہو، دوسرے اِنسان سے تولید کا رشتہ قائم کرتا ہے تو کائینات کے اٹل اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ یہ قانون، اصول، ہر جاندار پر حاوی ہے۔ حیوانوں، درندوں، پرندوں، کیڑے مکوڑوں، درختوں، پودوں غرضیکہ ہر زندہ جنس میں یہی ایک رشتہ بقا کا حامل ہے اور زندگی کے اولین لمحے سے مُسلط ہے۔

بیج زمین پر گرتا ہے۔ زمین سے غذا حاصل کرتا ہے اور پودا بنتا ہے۔ پودا بیج پیدا کرتا ہے۔ بیج اُسی زمین پر گر کر پھر ایک نئے پودے کی صورت اختیار کرتا ہے۔ پودے اور زمین میں غذا کی ضرورت پر مبنی رشتہ قائم ہو جاتا ہے لیکن کچھ فصلوں (پیڑیوں) کے بعد اُس زمین سے اُگے پودے کا بیج اُسی زمین میں ٹھیک طرح سے اُگ نہیں پاتا ہے۔ زمین میں بھی اُس بیج کا پودا اُگانے کی قوت برقرار نہیں رہتی۔ قوت برقرار رکھنے کے لئے اور پودا ٹھیک سے اُگانے کے لئے زمین میں قوت کھاد کی صورت میں منتقل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے

انسان نے مشاہدہ کیا۔ تجربے کئے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ لگاتار ایک ہی
زمین میں اسی زمین کا بیج ٹھیک سے اُگ نہیں پاتا۔ جانوروں پر تجربے کئے گئے۔
درندوں، پرندوں پر تجربے کئے گئے۔ کیڑے مکوڑوں پر تجربے کئے گئے۔ نتیجہ یہی برآمد
ہوا۔ چونکہ انسان ابھی انسانی خون اور خون میں قوت کے اضافے کرنے کے علم
سے نابلد ہے۔ اس لئے انسان نے اصول مرتب کیا کہ ایک ہی خون سے سینچے گئے
انسان تولید کے رشتے میں منسلک ہوں۔ تو کچھ پیڑھیوں (Generations)
کے بعد انسان کی مخصوص حالت خطروں سے دوچار ہوتی ہے۔ یوں انسان کے
ذہن میں حلال اور حرام کی تفسیر یا وجود میں آئی۔ حلال اُن رشتوں ناطوں کا
نام پڑ گیا جو انسان کی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے میں دشواری پیدا
نہیں کرتے ہیں۔ اور حرام اُن رشتوں ناطوں کا نام پڑ گیا جو انسان کی مخصوص
حالت بدستور برقرار رکھنے میں دشواری پیدا کرتے ہیں۔ روحانی، مذہبی،
جذباتی، ذات پات، نسل، قوم یا رنگ کی بنیاد پر اُن اصولوں کا اطلاق غلط ہے
دو فرد چاہیں مختلف قوم، مذہب، نسل، رنگ یا ذات سے وابستہ
ہوں آپس میں تولید کا رشتہ قائم کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ براہ راست
خون کے رشتے میں منسلک نہ ہوں۔ ایسے رشتے کسی صورت کائنات کے اٹل
اصولوں کے منافی نہیں

جنگل میں انسان جا رہا تھا۔ شیر نے حملہ کیا۔ آدمی نے مزاحمت کی شیر طاقتور تھا۔ انسان کم طاقتور تھا۔ انسان مارا گیا۔ انسان کی مخصوص حالت بدستور برقرار نہ رہی۔

جنگل میں دو انسان جا رہے تھے۔ شیر نے حملہ کیا۔ دونوں انسانوں نے مزاحمت کی۔ شیر طاقتور تھا واحد انسان کم قوت رکھتا تھا لیکن دو انسانوں کی قوت دوگنی ہو گئی۔ شیر مارا گیا۔ اور انسان کی مخصوص حالت بدستور برقرار رہی۔

انسان سمجھا۔ اجتماع میں طاقت ہے۔

کئی خاندان تحفظ کیلئے اجتماعی صورت میں رہنے لگے۔ اور قبیلوں کی بنیاد پڑی۔ قبیلے وجود میں آگئے۔ لیکن انسان میں ابھی اتنی جانکاری نہ پیدا ہوئی تھی کہ اپنے لئے حسب منشاء خوراک حاصل کر سکتا۔ خوراک کی کمی بیشی انسان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ اپنی حالت کو بدستور برقرار رکھنے کی خاطر ہر انسان دوسرے انسان کے ساتھ مل کر شکار کرتا تھا۔ پھل اکٹھے کرتا تھا۔ خوراک حاصل کرتا تھا اور ضرورت کے مطابق ہر انسان دوسرے انسان کے ساتھ مل بیٹھ کر استعمال کرتا تھا۔ خطروں کا ایک ساتھ مقابلہ، خوراک کی ایک ساتھ تلاش، گرمی سردی سے بچنے کی اجتماعی کوشش نے انسانی جنس میں کچھ

نئے رشتے، نئے ناطے اُبھارے اور اِنسان سوشل (social) بن گیا۔
نہ کوئی اپنی جگہ تھی۔ نہ کوئی زمین نجی تھی۔ نہ کوئی شئے ذاتی تھی۔ سب کائنات مشترک تھی جس کے حصہ دار چرند پرند، جانور درندے، پرندے اور اِنسان یعنی کائنات کی ہر جنس تھی۔

اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے اِنسان نے پھل دار درخت سے پھل حاصل کئے۔ کچھ کھالئے تو اُس کا پیٹ بھر گیا۔ ضرورت پوری ہوئی اِس لئے باقی پھل پڑے رہنے دیئے۔ دوسرے دن درخت پر پھل نہ ملے۔ بھوک نے ستایا۔ پڑے ہوئے پھل کھائے۔ تجربے نے اِنسان کے ذہن میں ایک نئی سوچ کو جنم دیا۔ اِنسان پھل جمع کرکے رکھ سکتا ہے اور حسبِ ضرورت استعمال کرکے اپنی حالت بدستور برقرار رکھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ کوئی دوسرا اِنسان جمع کئے ہوئے پھل نہ کھا جائے۔ اِس سوچ کا احساس جائیداد کے اصول کی پہلی کڑی بن گیا۔

پھل کچھ دِن پڑے رہنے سے سڑ جاتے ہیں۔ استعمال کے قابل نہیں رہتے لیکن درخت پر لگے رہنے سے پھل بہت دن خراب نہیں ہوتے۔ اِنسان کے ذہن میں یہ بات آگئی تو اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے کے خاطر اِنسان نے پھل توڑ کر جمع رکھنے کے بجائے درخت پر ہی قبضہ جما دیا۔ دوسرے اِنسان نے دوسرے درخت پر قبضہ جمایا۔ اب درخت اِنسان کی جائیداد میں منتقل ہو گئے۔

جن انسانوں کے قبضے میں درخت نہیں آئے۔ وہ اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے کی خاطر درختوں پر قبضہ جمائے انسانوں سے بھڑ پڑے۔ خون خرابہ شروع ہو گیا۔ ہر انسان دوسرے انسان کے لئے خطرہ بن گیا۔ انسان طاقتور ہوتا تھا تو دوسرے انسان کو مار کر قبضہ برقرار رکھ لیتا تھا۔ انسان کمزور ہوتا تھا تو قبضہ برقرار نہیں رکھ پاتا تھا۔ کائینات کے اٹل بنیادی اصول کے تحت انسانی جنس کو کائینات کی ہر اور جنس سے پریم پیار سے رہنا تو تھا ہی لیکن انسان کے ذہن میں جائیداد کے احساس نے انسان کو اپنی ہی جنس کے دوسرے فرد سے پریم پیار سے رہنے پر آمادہ کر دیا۔ جو کائینات کا بنیادی اصول نہیں۔ اس لئے غیر فطری ہے۔ اور جائیداد کا احساس غیر فطری بن جاتا ہے۔

طاقتور آدمی روز طاقتور نہیں رہتا۔ دوسرے کے ہاتھوں زخمی ہو کر کمزور ہو سکتا ہے۔ بیماری یا بڑھاپے کی آمد پر بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ اس لئے اپنی ضرورت کو محفوظ رکھنے کی خاطر طاقتور انسان نے طاقت کا سہارا لیکر جائیداد کے فرضی اصول گڑھ کر کمزور انسان پر ٹھونس دیئے کہ جو درخت جس انسان کے پاس ہے ہر حالت اور ہر لمحے اُسی انسان کے پاس رہیگا۔ اور دنیا کی سطح پر پہلی بار بیانگ دُہل فرضی نعرے بلند ہونے لگے "یہ میرا درخت ہے" "یہ میری ملکیت ہے" "یہ میری وراثت ہے"

در اصل نہ درخت کسی کا ہے۔ نہ زمین جس پر درخت کھڑا ہے کسی کی ہے۔
انسان کے وجود سے پہلے بھی درخت زمین پر موجود تھے اور انسان کی موت کے
بعد بھی درخت زمین پر موجود رہتے ہیں۔ اس لئے جائیداد کا احساس انسان کے
ذہن اور صرف انسان کے ذہن کی پیداوار ہے۔ ہاں کسی حد تک یہ احساس انسان
سے کم ذہن رکھنے والے جانداروں میں بھی دماغ کے تناسب سے پیدا ہوتا ہے۔
پرندے گھونسلوں کو اپنی جائیداد سمجھتے ہیں اور کسی غیر کو گھونسلوں کے پاس
پھٹکنے نہیں دیتے۔ درندے کچھاروں کو اپنی جائیداد سمجھتے ہیں۔ لیکن کیڑے
مکوڑوں میں دماغ کی کمی کی وجہ سے اپنی جگہ کا تصور بالکل نہیں ہوتا ہے۔
وہ جہاں اور جس جگہ اپنے آپ کو محفوظ پاتے ہیں پڑے رہتے ہیں۔
درندہ اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے انسان کے پیچھے
لگ گیا تاکہ کھا کر بھوک مٹا سکے۔ انسان اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے
کے لئے بھاگ کھڑا ہوا۔ حرکت کرنے سے انسان کی قوت صرف ہوئی اور
وہ تھکن سے چور چور ہو گیا۔ تھکن دور کرنے کے لئے بدن میں قوت برقرار
رکھنی پڑتی ہے۔ اور قوت خوراک سے حاصل ہوتی ہے۔ انسان کے قبضے
میں درخت پر پھل لٹک رہے تھے۔ لیکن انسان کے پاس اتنی قوت نہ
رہی تھی کہ کشش ثقل (زمین کی قوت) کے برخلاف درخت پر چڑھ کر پھل

توڑ سکے اور یوں اپنی خوراک پوری کر کے اپنی صرف کی ہوئی قوت بحال کر سکے۔

ایک اور انسان خوراک کی تلاش میں اُس طرف آنکلا۔ درخت پر پھل لٹکے دیکھے لیکن پھل نہیں اُتار سکا۔ درخت پہلے انسان کے قبضے میں تھا۔ وہ بھوکا کھڑا صرف پھلوں کو تاکتا رہا۔

پہلے اِنسان کو بھوک نے پریشان کر دیا تھا۔ ضرورت نے اس کے ذہن کو سوچنے پر اُکسایا۔ خیال وجود میں آگیا۔ اس نے اپنا خیال دوسرے اِنسان کے سامنے ظاہر کیا۔ دوسرا انسان پہلے انسان کے قبضے میں درخت پر چڑھ کر دو پھل اُتار کے لا دے تو ایک پھل اُسکو بھی مل سکتا ہے۔ دوسرے اِنسان نے اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے کی خاطر پیش کش قبول کر لی۔ اس کام کے صِلے میں پہلے اِنسان نے ایک پھل دوسرے انسان کو دے دیا۔ لیجئے ایک اِنسان نے ملکیت کے حقوق بروئے کار لا کر دوسرے اِنسان کے بل بوتے پر اپنی ضرورت پوری کی اور بغیر کسی کاوش کے اپنی حالت بدستور برقرار رکھی۔ یہ اِنسان کی اِنسان کے استحصال کی پہلی حرکت تھی۔

علمی نکتہ نگاہ سے دیکھا جائے تو کائینات کے ایک اہم اصول کی یوں وضاحت ہوتی ہے۔ کہ کوئی بھی شئے کتنی ہی قوت صرف کرے۔ جب تک یہ قوت حرکت میں منتقل نہ ہو جائے تب تک کام تصور نہیں کیا جاتا۔ پھر اپنی

جگہ پر کھڑا ہے۔ کھڑے رہنے کی حالت میں بھی پتھر قوت استعمال کر رہا ہے۔
کشش ثقل ضائع کرنے کے لئے قوت صرف کر رہا ہے۔ ہواؤں کا زور رد
کرنے کے لئے قوت صرف کر رہا ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ پتھر کچھ کام نہیں کر رہا ہے۔
انسان کھڑا ہے۔ درخت پر پھل لٹک رہے ہیں۔ انسان سوچ رہا ہے
کہ پھل اُتار کر کھالے لیکن پھل اُتارنے کے لئے درخت پر چڑھنے کی حرکت نہیں
کر رہا ہے۔ گو کھڑے رہنے، پھل کو تاکنے کے لئے برابر قوت صرف کئے جا
رہا ہے۔ تو کہا جائیگا کہ انسان کچھ کام نہیں کر رہا ہے۔

انسان کا ذہن سوچ کی قوت استعمال کر کے کتاب کا مواد ذہن
میں جمع کرتا ہے۔ ناول کا پلاٹ بنتا ہے لیکن ہاتھ پیر ہلا کر کتاب نہیں لکھتا۔
تو کہا جاتا ہے کہ انسان کچھ کام نہیں کر رہا ہے۔ محنت نہیں کر رہا ہے۔ خالی
خولی سوچ رہا ہے۔ نئی سوچ ہو یا پرانی سوچ۔ محنت نہیں کہلائی جائیگی
جب تک سوچ حرکت کی حد دور میں داخل نہ ہو۔ حرکت پیداوار کی
علامت ہے۔

درخت پر چڑھ جانے سے انسان کی قوت صرف ہو جاتی ہے۔
ہاتھ پیروں میں قوت کی کمی تھکن کے احساس کو جنم دیتی ہے۔ درخت
پر چڑھنے سے احتراز کیا ہے تو قوت خرچ نہیں ہو جائیگی۔ اپنی قوت

بدستور برقرار رکھ کر انسان اپنی حالت بدستور برقرار رکھ سکتا ہے۔ اور تھکن کے تکلیف دہ احساس سے بھی نجات پا سکتا ہے۔ استحصال کی پہلی حرکت جو قدرتی طور پر انسان کو اپنا وجود (حالت) بدستور برقرار رکھنے کی خاطر سرزد ہوئی تھی۔ انسان کے ذہن نے غیر قدرتی مقام پر لا کر کھڑی کر دی۔ انسان طاقتور، تازہ دم ہو کر بھی ایسی سوچ کے تحت کام کرنے سے احتراز کرنے لگ گیا اور موقعہ بے موقعہ ملکیت کا غیر فطری حق جتا کر کمزور و مجبور انسان کا استحصال کرنے لگا۔

پھل دار درخت اُگتے ہیں برسوں لگتے ہیں۔ انسان پیدا ہونے میں نو مہینے لگتے ہیں۔ یوں گنتی کے تناسب سے درختوں کی تعداد انسان کی تعداد کی مناسبت سے کم ہو گئی۔ خوراک کی کمی شدید ہو گئی اور انسانی جنس خطرے سے دوچار ہونے لگی۔ بھوک سے پریشان ہو کر انسان کچھ ایسی چیزیں خوراک کے طور پر استعمال کرنے پر مجبور ہو گیا جن سے وہ نامانوس تھا۔ انسان نے چھوٹے پودوں (گھاس) کے بیج کھانے شروع کئے۔ جب اُن سے بھی پیٹ نہ بھرا تو چھوٹے چھوٹے پودوں کو بھی تلبوت نکلنے لگا۔ اس طرح انسان نے اناج اور سبزیوں کو خوراک کے طور پر اپنایا تاکہ اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھ سکے۔

ریتلے پتھریلے علاقوں میں گھاس سبزیاں وافر مقدار میں نہیں اگ آئیں۔ ایسے علاقوں میں انسان نے درندوں، پرندوں، اور حیوانوں کا گوشت کھانا شروع کیا۔ جنگلوں میں رہنے والے انسان کی خوراک پھل پھول رہے۔ میدانوں میں گھاس اور بیج پر انسان پلتا رہا۔ سمندروں جھیلوں کے آس پاس رہنے والے انسان نے مچھلیوں اور کیڑوں مکوڑوں پر اکتفا کیا۔ غرضیکہ انسان کو جس جگہ جو چیز ہضم کرنے کے لائق میسر ہوئی اور انسان کی حالت بدستور برقرار رکھنے میں مددگار ثابت رہی۔ وہ اُس کی خوراک بن گئی۔

انسان نے دیکھا کہ درندے، جانور سردی گرمی کے اُتار چڑھاؤ سے اتنا اثر انداز نہیں ہوتے جتنا انسان ہوتا ہے۔ مشاہدے سے انسان کے ذہن میں یہ بات آگئی کہ بال و پر پرندوں، درندوں کے جسم پر سردی گرمی کو اثر انداز ہونے سے روکتے ہیں۔ جب کہ انسان کے جسم پر بال و پر گرمی سردی کو روکنے کے لئے میسر نہیں۔ گوشت کھانے والے انسان کے پاس جانوروں کی کھالیں میسر تھیں۔ اس نے کھالوں سے جسم ڈھک لینا شروع کیا۔ ایک مخصوص قسم کا لباس وجود میں آگیا اور انسان سردی گرمی کی دستبرد سے بچ کر اپنی حالت بدستور برقرار

رکھنے میں کامیاب رہا۔

بیج کھانے والے انسان کے خطے میں درندوں جانوروں کی کمی تھی۔ انسان نے درخت کی چھال اور گھاس پھوس سے تن ڈھانپنا شروع کیا۔ گھاس پھوس بدن پر اٹکا نہیں رہتا تھا۔ انسان نے مشاہدہ کیا۔ درخت کی ٹہنی ٹوٹ کر گری اور گر کر دوسری ٹہنی میں اٹک گئی۔ انسان نے گھاس پھوس کے تنکوں کو ایک دوسرے میں اٹکانا شروع کیا۔ بُنائی کا فن صفحہ ہستی پر نمودار ہو گیا۔ ایک نئے قسم کا لباس وجود میں آ گیا اور انسان سردی گرمی کی یلغار روک کر اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔

یوں دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف لباس جیوگرافی حالات کے پیشِ نظر وجود میں آ گئے۔ گرم خطوں میں سورج کی تیز کرنوں نے انسان کا جسم جھلسا کر سیاہ کر دیا اور انسان کی جلد سخت کر دی بنا دی۔

سرد خطوں کے انسان کا جسم گورا اور کھال ملائم رہی۔ آب و ہوا کے زیرِ اثر انسان کا جسم مختلف رنگ اختیار کرتا گیا۔

پھل کھانے والے انسان کو بازوؤں کی مدد سے درخت پر چڑھنا پڑتا تھا اس لئے انسان کی قوت کا بیشتر حصہ بازوؤں

اور اُن کے ارد گرد پھیلے اعضاء میں منتقل ہوتا رہا۔ انسان کے بازو اور چھاتی جسم کے باقی اعضاء کے تناسب سے زیادہ مضبوط ہو گئے۔

پہاڑوں اور ٹیلوں پر رہنے والے انسان کو کشش ثقل کا توازن رکھنے کے لئے جھک کر چلنا پڑتا تھا۔ لگاتار جھکاؤ سے انسان کی کمر میں جھکاؤ کی صفت نمودار ہو گئی اور ایسے انسان کا جسم گُھٹی گُھٹی صورت اختیار کرتا گیا۔

پتھریلے ریتلے علاقوں میں انسان کو درندوں پرندوں کے پیچھے خوراک حاصل کرنے کے لئے دوڑ لگانی پڑتی تھی۔ ایسے علاقے کے انسان کی ٹانگیں لمبی اور مضبوط ہوتی گئیں۔ قد آور انسان پروان چڑھنے لگے۔

برفیلے علاقوں میں سورج کی کرنیں آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتی ہیں۔ اِن خطوں کے انسان آنکھیں مِیچ کر رہنے پر مجبور ہو گئے۔ اور انسان کی آنکھ صورت بدلنے پر مجبور ہو گئی۔

یوں جیوگرافیائی حالات کے مطابق انسان کے ظاہری خدوخال مختلف ہوتے گئے اور دنیا کی سطح پر مختلف نسل وجود میں آ گئے۔

جہاں مرد اور عورت ملنا سب گفتی میں ہوجود ہتے انسان جوڑیوں

میں بٹ گیا۔ جہاں مردوں کی تعداد عورتوں کی تعداد سے کم تھی وہاں مرد کئی عورتوں سے بندھا رہا۔ اور جہاں عورتوں کی تعداد مردوں کی تعداد سے کم تھی وہاں کئی مردوں نے واحد عورت کے ساتھ رشتہ قائم کیا۔ یوں انسان نے جنسی خواہشات کی ضرورت پوری کردی اور مختلف علاقوں میں شادی بیاہ کے مختلف طور طریقے ایجاد ہو گئے۔

بچے کو جنم دیتے وقت عورت اس قابل نہیں رہتی کہ کائنات میں سرگرداں قوتوں کا مقابلہ کر کے اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھ سکے۔ عورت کے جسم کے اعضا کی یوں تشکیل ہوئی ہے کہ نو زائیدہ کمزور بچے کو ملائم اور شفاف اعضاء کا لمس میسر رہے۔ اس لئے عورت کے جسم میں سختی کے بجائے نرمی کی لچک عیاں ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر عورت مرد سے کمزور ظاہر ہوتی ہے حالانکہ قوت کے مقدار کے لحاظ سے عورت مرد سے افضل ہے ورنہ عورت کا تولید کے مرحلے سے صحیح وسالم گذرنا محال ہو جائے۔ لیکن ظاہری حالت اور صورت دیکھ کر مرد نے عورت کو کمزور سمجھا۔ یوں بھی تولید کے مرحلے پر عورت مرد کے رحم وکرم کی خواستگار رہتی ہے۔ نتیجے کے طور پر عورت انسانی جلنس کے دوسرے اکائی مرد کے طابع ہوتی رہی۔ یوں

انسان نے انسان کا استحصال کیا۔ کہیں عورت کو اپنی نجی جائیداد بنا دیا۔ کہیں عورت کو مشترکہ ملکیت سمجھ کر بانٹ لیا اور کہیں عورت کو ذہنی عیاشی کے داؤ پر لگا دیا۔ حالانکہ عورت اور مرد، دونوں کا وجود انسانی جنس کی بقا کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور زندگی کی دوڑ میں برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔

کھانے پینے کے، تن ڈھانپنے کے طور و طریقے، عورت مرد کے رشتے ناطے اور رسم و رواج مجموعی طور پر کلچر (culture) کہلائے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف تہذیبیں نمودار ہو گئیں۔ ہر خطے کی تہذیب میں وہاں کا انسان عادی ہو کر پابند ہو گیا۔ اس لئے ایسے انسان کا ہر دوسری تہذیب سے تباہ مشکل بن گیا۔ انسان کا علم اس درجے پر نہ پہنچا تھا کہ تجربہ کر کے اس حقیقت سے آشنا ہو جاتا کہ کل کائنات میں انسان کی جنس واحد ہے۔ انسان کی ماہیئت، خصوصیت، حالت ایک ہے۔

اپنے جنس کی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے کی جدوجہد میں انسان نے ارتقاء کے مختلف مرحلوں پر مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا سہارا ضرور لیا۔ لیکن ہر مذہب، تہذیب، قوم اور نسل کا تصور ارتقاء کے مختلف مرحلوں پر علم کی مقدار پر مبنی رہا۔

جوں جوں انسان کا علم بڑھتا جائیگا توں توں انسان کا تصور بھی بدلتا جائیگا۔ لاعلمی، ناسمجھی اور جہالت کی بنا پر کائینات کے حقیقی علم کو فراموش کر کے فرسودہ، دقیانوسی تصورات میں پابند رہ کر انسان اپنی جنس کو بدلتی دنیا کے بدلتے حالات میں بدستور برقرار رکھنے میں کامیاب نہیں رہ سکتا۔

دو انسان عورت اور مرد اپنی جنسی صفت پوری کرنے کے لئے ایک دوسرے سے منسلک ہو گئے۔ تیسرا انسان وجود میں آگیا۔ سلسلہ چلتا رہا اور انسانی جنس پھیلتی گئی۔ آبادی بڑھتی گئی۔ اور تناسب سے خوراک کم ہوتی گئی۔ انسان کی حالت خطرے میں پڑ گئی۔ اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے انسان کے دماغ کی صفت سوچ بروئے کار آگئی۔

انسان نے دیکھا بیج مٹی میں گر گیا۔ مٹی نے بیج کو اپنی آغوش میں جکڑ لیا۔ پودا نمودار ہوا۔ ایک بیج کے بہت سارے بیج بن گئے۔ بیج زمین پر نہیں گرا۔ مٹی نے بیج کو آغوش میں نہیں جکڑ لیا۔ پودا نمودار نہیں ہوا۔ اور ایک بیج کے بہت سارے بیج نہیں بن سکے۔ مشاہدے نے انسان کے ذہن میں علم کو جنم دیا۔

علم کے برتے پر انسان نے مٹی کرید کر بیج کو مٹی کی آغوش کے سپرد کر دیا پودا اُگ آیا۔ ایک بیج کے بہت سارے بیج بن گئے۔ مٹی کریدنے اور بیج کو مٹی کے سپرد کرنے میں انسان کی قوت صرف ہوئی تھی۔ بیج کھا کر انسان کی قوت پوری ہو گئی اور اس کی جسمانی حالت بدستور برقرار رہی۔ اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے انسان محنت (قوت استعمال کرنے) پر مجبور ہو گیا۔

پتھریلے ریتیلے خطوں میں انسان درندوں، پرندوں کے گوشت پر اپنا وجود قایم رکھے ہوئے تھا۔ درندے پرندے کم ہو گئے۔ انسان کی خوراک کم ہو گئی۔ مشاہدے نے انسان کے ذہن کو اس قابل بنا دیا کہ درندوں، پرندوں پر قابو پالے۔ ذہنی اور جسمانی لحاظ سے طاقتور جانوروں اور درندوں پر وہ قابو نہ پا سکا۔ کمزور درندوں اور پرندوں پر قابض ہو گیا۔ ان کو پالا۔ پوسا۔ بچوں کی طرح ان کی خبر گیری کی۔ جب ضرورت پڑی ان کو مار کر اپنی خوراک پوری کر لی۔ اور اپنی مخصوص حالت ناموافق حالات میں بھی بدستور برقرار رکھی۔

انسان کا بدلنا مادے کے مختلف صورتوں یا طاقتوں کا

اجتماع ہے۔ ہڈی چونے سے بنتی ہے۔ گوشت اور پٹھے پروٹین سے بنتے ہیں۔ نشاستہ کافی مقدار میں موجود ہوتا ہے۔ خون ہوتا ہے اور خون میں پانی ہوتا ہے دھاتیں ہوتی ہیں۔ کسی ایک مادے کی حالت کا توازن بگڑنا شروع ہو جائے تو انسان کی حالت بدستور برقرار نہیں رہ سکتی۔ انسان بیمار ہو جاتا ہے اور مر بھی سکتا ہے۔ توازن ٹھیک کرنے کیلئے انسان ضرورت کی چیزیں دوائی کی صورت میں بدن کے اندر پہنچاتا ہے اور یوں اپنے بدن کی حالت بدستور برقرار رکھنے کیلئے مادے کی مختلف صورتوں یا حالتوں کا سہارا لیتا ہے۔

انسان کی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے صرف اناج کی ضرورت نہیں بلکہ متناسب مقدار میں گوشت کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ پھل کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ دودھ کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔

انسان کا پیٹ خوراک سے خالی ہو جاتا ہے۔ تو معدے میں موجود خوراک ہضم کرنے والے تیزاب معدے کی دیواروں کو چاٹنے لگتے ہیں۔ معدے کی دیواریں تیزاب کی یلغار سے اپنی حالت بدستور محفوظ و برقرار رکھنے کی خاطر اعصاب کے ذریعے دماغ کو خبر کرتی ہیں۔ دماغ میں بھوک کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ بھوک کی صفت کے ہاتھوں مجبور ہو کر دماغ بدن کے مختلف اعضا کو خوراک حاصل

کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور انسان کے جسم میں چاہت جنم لیتی ہے۔

خوراک نہ ہو تو بھوک لگتی ہے اور خوراک کی چاہت ہوتی ہے۔ معدہ پُر ہو تو چاہت نہیں ہوتی۔ پانی کم ہو جائے تو پیاس لگتی ہے اور پانی کی چاہت ہوتی ہے۔ پانی بدن میں موجود ہو تو پانی کی چاہت نہیں رہتی۔

بدن تندرست و توانا ہو۔ تخلیقی قوتوں سے مالا مال ہو تو مباشرت کی ضرورت پڑتی ہے اور ساتھی کی چاہت ہوتی ہے۔ بدن بیمار، کمزور ہو تو ساتھی کی چاہت نہیں ہوتی چونکہ بچوں میں تخلیقی اعضاء پوری طرح نشو ونما نہیں پائے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے بچوں میں مُباشرت کی چاہت نہیں پیدا ہوتی۔

بیج والے انسان نے اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے گوشت والے انسان سے گوشت حاصل کیا اور بدلے میں گوشت والے انسان کی ضرورت پوری کرنے کے لئے بیج دے دئے۔ یوں دونوں انسان اپنے جسم کا توازن بدستور برقرار رکھنے کے قابل بن گئے۔

دونوں انسانوں کی ضرورت پوری تو ہو گئی لیکن دونوں انسان اس ادل بدل سے مُطمئن نہیں ہوئے۔ بیج والے انسان نے سوچا۔ سال بھر زمین کُریدی۔ ہاتھوں پیروں پر چھالے برداشت کئے۔ کمر جھلک کر دہری

ہو گئی تب کئی بیج کے کچھ دانے اُگ آئے۔ سال بھر کی جان توڑ محنت کے بدلے میں اتنا تھوڑا سا گوشت!

گوشت والے انسان نے سوچا۔ سال بھر جانوروں پرندوں کو پالا۔ رات دن اِن کی خبر گیری کی۔ ان کی دولتیاں سہہ لیں تب کہیں گوشت حاصل ہوا۔ سال بھر کی محنت کے بدلے میں اتنے تھوڑے سے بیج!

اِنسان کی حالت مشکل سے دوچار ہو گئی۔ بیج والے اِنسان کو گوشت نہ ملے اور گوشت والے انسان کو بیج نہ ملیں تو دونوں اِنسان اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے کے قابل نہیں رہتے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اِنسان کا دماغ حل ڈھونڈھنے میں جُٹ گیا۔ دماغ کی صفت سوچ نے دونوں پہلوؤں کے حساب سے محنت کا اوزان ایجاد کیا۔ اِنسان نے تول قایم کر لیا۔ اتنے سارے گوشت کے بدلے اتنے سارے بیج۔ تبھی پھل کھانے والا انسان آدھمکا۔ پھل والے انسان کو بھی اپنے بدن کی ضرورت پوری کرنے کے لئے گوشت اور بیج کی ضرورت تھی۔ بدلے میں وہ اوروں انسانوں کے لئے پھل کی ضرورت پوری کر سکتا تھا۔ لیجئے ایک نیا تول ایجاد ہو گیا۔

انسان کو جتنی زیادہ چیزوں کی ضرورت پڑتی گئی اتنے تول ماپ
ایجاد کرتا گیا حتےٰ کہ یاد داشت نے جواب دینا شروع کیا۔ آخر کار انسان
نے سکہ ایجاد کیا۔ پہلے مٹی کا سکہ ایجاد کیا۔ پھر پتھر کا سکہ ایجاد کیا۔
اور آخر میں دھات کا سکہ ایجاد کیا۔ ہر سکے سے ہر چیز کا بدل دوسری
چیز میں ہو سکتا تھا۔ بیج کے اتنے دالوں کے بدلے اتنے سکے۔ تب
اتنے سکوں سے اتنے پھل یا اتنا سارا گوشت۔
یوں انسان نے اپنی ضرورت آسانی سے پوری کرنے کے لئے
سکہ (روپیہ پیسہ) ایجاد کیا۔ ظاہر میں روپے پیسے کی افادیت ہر
شئے سے اہم محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان کے پاس روپیہ
پیسہ وافر مقدار میں موجود ہو تو ہر چیز خرید کر اپنی ہر ضرورت پوری
کر سکتا ہے۔ لیکن اصل میں روپیہ پیسہ انسانی وجود کی برقراری
کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ انسان کے پاس ڈھیروں سکے ہوں۔
ہزاروں، لاکھوں روپئے ہوں۔ ہاتھ، پیر کی محنت سے اناج نہ پیدا
کرے تو اناج کے بدلے سکے نہیں چبا سکتا۔ اپنے جسم کی مخصوص
حالت برقرار رکھنے کے لئے انسان کی پہلی ضرورت خوراک ہے۔
دوسری ضرورت لباس کی ہے رہنے کے لئے مکان کی ضرورت ہے۔ بیماری

سے بچنے کے لئے دوا دارو کی ضرورت ہے۔ اناج، لباس، مکان، دوا دارو پیدا کرنے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ اس لئے انسان کی اصلی دولت انسان کی محنت ہے۔ جسکو صرف کر کے، خرچ کر کے انسان پھل، اناج، گوشت، دوا دارو، مکان، لباس اور زندہ رہنے کے دیگر لوازمات پیدا کرتا ہے۔ ایسی اشیا بازار میں موجود نہ ہوں تو سکے کے ڈھیر بھی ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ ہاں انسان کے پاس سکے نہ بھی ہوں لیکن محنت کر کے اناج، گوشت، پھل پیدا کر سکتا ہو تو سکے نہ ہونے کے باوجود انسان اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھ سکتا ہے۔

انسان پیدا ہوتا ہے تو اپنے بدن کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا ہے۔ جائیداد نہیں ہوتی ہے سکے نہیں ہوتے ہیں۔ تن ڈھانپنے کے لئے کپڑے بھی نہیں ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ پیٹ بھرنے کے لئے دودھ بھی نہیں ہوتا ہے۔ انسان ہونٹوں، حلق اور معدے کی حرکت (محنت) سے ماں کا دودھ حاصل کر کے اپنی حالت بدستور برقرار رکھتا ہے۔ بڑا ہو جاتا ہے تو بازوؤں، ٹانگوں کی محنت سے پھل، اناج، گوشت پیدا کر کے ہونٹوں، حلق اور معدے سے بدستور محنت کر کے اپنے بدن کی آبیاری کرتا ہے۔ غرضیکہ انسان

کا ہر عضو سوتے جاگتے مثلاً دل، دماغ، خون، اعصاب پٹھے، جگر معدہ وغیرہ حرکت کرتا رہتا ہے۔ محنت کرتا رہتا ہے۔ تب کہیں انسان اپنی حالت بدستور برقرار رکھ سکتا ہے۔ یعنی انسان زندہ رہتا ہے ایک بھی عضو محنت کرنے سے احتراز کرلے تو انسان اپنی حالت بدستور برقرار نہیں رکھ سکتا۔ حرکت زندگی ہے یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں محنت زندگی ہے۔

مادے کی ماہیئت کی جانکاری اور بل بوتے پر انسانی جنس ترقی کے مراحل طے کرتی گئی۔ مادے کی مخصوص حالت دماغ کی بدولت آج کل کی دنیا تعمیر کرلی۔ بلڈنگیں کھڑی کیں۔ مشینیں بنائیں۔ صحراؤں کو لالہ زار کردیا۔ سڑکوں پر پھسلا۔ ہواؤں میں اڑا۔ سمندروں میں تیرتا پھرا۔ رات کو دن بنادیا۔ کشش ثقل کے طاقتور دائرے سے آزاد ہوگیا۔ اور ایٹم کے راز کو قابو میں کرکے قوت کے بحر بیکراں پر قابض ہوگیا۔

آج کا انسان ارتقا کے ایسے مرحلے پر کھڑا ہے۔ جہاں وہ جو چاہے کرسکتا ہے۔ مٹی سے سونا بنا سکتا ہے۔ سونے کو گوشت میں تبدیل کرسکتا ہے۔ گوشت سے لوہا حاصل کرسکتا ہے اور لوہے

کو کپڑے میں منتقل کر سکتا ہے لیکن اس مرحلے پر پہنچ کر انسان کا دماغ بے قابو ہونے لگتا ہے۔ وہ انسانی جنس کو مادے کے ذروں کی حالت میں پابند نہیں سمجھتا بلکہ مادے سے الگ فرضی ڈھکوسلوں میں پابند کر رہا ہے۔ انسان سوچ رہا ہے کہ بلڈنگیں، جہاز، سڑکیں، راکٹ غرضیکہ مادے کی ہر نئی صورت اسکی اپنی تخلیق ہے اور کائنات کے ارتقا میں شامل نہیں۔

مٹی گارے میں مادے کی ایک صفت چپک نہ ہوتی تو بلڈنگیں کیسے کھڑی رہ سکتی ہیں۔ ہوا میں مادے کی دوسری صفت دباؤ نہ ہوتا تو ہوائی جہاز کیونکر اڑ پاتا۔ لوہے میں مادے کی ایک اور صفت سختی نہیں ہوتی تو مشینیں، موٹریں کیسے بن سکتی تھیں۔ مادے کے ذروں "ایٹم" میں قوت پنہاں نہ ہوتی تو دنیا بنانے کیلئے انسان قوت کہاں سے حاصل کرتا۔

انسان بذات خود مادے کا نہ بنا ہوتا تو مادے کی نئی صورتوں کو کن ہاتھوں سے تشکیل کرتا۔ کن آنکھوں سے دیکھتا کس دماغ سے پرکھتا اور کون سا ذہن انسانوں کو آج کی دنیا تعمیر کرنے میں مددگار رہتا۔

انسان کائنات سے الگ وجود کی حیثیت سے یہ سب کچھ نہیں

کر رہا ہے بلکہ انسان کی صورت میں مادے کی ذات کر رہی ہے

جیسے مٹی، ہوا، پتھر، لوہا، پودے اور چرند پرند مادے کی صفات

سے مزین مختلف مراحل طے کرتے ہیں۔

بیج مٹی کے ہاتھ لگ گیا۔ درخت وجود میں آگیا۔ درخت

نے آگ پکڑلی۔ کوئلہ وجود میں آگیا۔ آگ نے کوئلے کو ٹٹولا۔ راکھ

کا ڈھیر بن گیا۔ راکھ مٹی میں مل گئی۔ پودے نے سر اُبھارا۔ مٹی دباؤ کے

پنجوں میں پھنس گئی پتھر وجود میں آگیا۔ پتھر انسان کی دسترس

میں آگیا مکان بن گیا۔ لوہا انسان کو میسّر ہوا مشین بن گیا۔

مشین کے قابو میں انسان آگیا مٹی بن گیا۔ یہ ریل پیلی، یہ ادل بدل،

یہ حرکت مادے کی مخصوص صفت ہے۔ انسان کسی صورت مادے

سے بنے اپنے جسم کو مادے سے بنی کائنات سے الگ نہیں کر سکتا

ہے۔ اور نہ ہی اپنی کسی حرکت کو مادے سے بنی کائنات کی حرکات

سے جدا درجہ دے سکتا ہے۔ انسان کی ہر حرکت، ہر ایجاد، ہر

تشکیل مادے سے بنے کائنات کی حرکت ہے۔ ایجاد ہے تشکیل

ہے۔ انسان کائنات کا اتنا ہی ایک اہم حصہ ہے جتنا ایک پودا،

مٹی کا تودہ، لوہے کا ٹکڑا یا ہوا کا جھونکا۔

ارتقار کے پہلے لمحے سے حال تک جو بھی حرکت انسانی جنس سے سرزد ہوئی ہے وہ ہر لحاظ اور ہر رنگ سے انسان نے اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے کی ہے۔ لاعلمی اور ناتجربہ کاری نے اسکو وقت وقت پر کچھ عقیدے اور معروضے قایم کرنے پر مجبور کر دیا۔ جو بظاہر اسکے اوراک کو مطمئن کرتے محسوس ہوتے تھے لیکن اصل میں کائینات کے اٹل اصولوں پر مبنی نہ تھے۔ جوں جوں انسان کا علم تجربہ بڑھتا گیا توں توں انسان پرانے عقیدوں، معروضوں کو رد کرتا آیا ہے۔ یوں ایک مذہب کے بعد دوسرا مذہب، ایک کلچر کے بعد دوسرا کلچر اور ایک تمدن کے بعد دوسرا تمدن روئے زمین پر نمودار ہوتا گیا۔ ہر نیا مذہب، کلچر، تمدن پرانے مذہب، کلچر، تمدن کے عقیدوں اور معروضوں کو رد کر کے نئے علم اور جانکاری کی مقدار پر مبنی نئے عقیدوں اور معروضوں سے آراستہ ہوتا آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علم سے بے بہرہ انسان نے غلط عقیدوں اور معروضوں کے ماحول میں پابند ہو کر صحیح علم سے بہرہ ور انسانوں سے ٹکر لی۔ انہیں جادوگر سمجھ کر جلا دیا۔

اُنہیں مُنکر سمجھ کر سولیوں پر چڑھایا۔ ان کا خون بہایا۔ یوں اِنسان
اپنی اِنسانی جنس کی حالت بدستور برقرار رکھنے کی سعی کرنے کے
بجائے اپنی ہی انسانی جِنس کو نیست و نابود کرنے کے درپے رہتا ہے۔

رسل و رسائل نے اِنسان کو انسان کے اتنے قریب کر دیا ہے
کہ اِنسان کی سوچ مجبور ہے کہ اپنی جِنس کی بقار کے لئے، اپنی مخصوص
حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے اپنی ہر حرکت، ہر سوچ، ہر سمجھ کو
کائینات کی حرکات سے ہم آہنگ کر کے صحیح معنوں میں انسانیت
تعمیر کر لے۔

اِنسان کو اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے
ایک اہم ضرورت خوراک کی ہے۔ بدن کی نشو و نما کے لئے غذا میسّر
نہ ہو تو انسان کسی صورت اپنی حالت بدستور برقرار نہیں رکھ سکتا۔
اس لئے خوراک حاصل کرنے کا حق انسان کی آزادی تصور کی جاتی
ہے۔ حلال حرام کا فرضی تصور دے کر انسان کو خوراک حاصل کرنے
سے باز رکھنے کی سعی کرنا۔ انسانی جنس کی بقا کے منافی ہے۔

اِنسان اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھنے کی خاطر خطرات
سے آزاد رہنے کا حق رکھتا ہے۔ طوفان، گرمی، اور زلزلوں سے بچاؤ کی

خاطر انسان کو سر چھپانے کے لئے جگہ کی ضرورت ہے۔ جن پر روک لگائی جائے تو انسان بحیثیت انسان بدستور برقرار نہیں رہ سکتا۔ قسمت، تقدیر اور جنت جہنم کا واسطہ دے کر انسان کو پابند کر دینا انسانی جینس کی بقاء کے منافی ہے۔

خوراک حاصل کرتے، درندوں طوفانوں اور دیگر خطروں سے محفوظ رہنے کے لئے انسان کو گھومنے پھرنے کی آزادی کا حق ہے۔ جغرافی خطے کا انسان خوراک مکان کی تلاش میں زرخیز خطے میں وارد ہونے کا حق رکھتا ہے۔ ورنہ انسان جیو گرافیائی قوتوں کے سامنے اپنی حالت بدستور برقرار نہیں رکھ سکتا۔ ملک، ماتر بھومی اور قوم کا فرضی تصور برقرار رکھ کر انسان کی حرکات کو پابند کرنا انسانی جینس کی بقا کے منافی ہے۔

انسان صدیوں کے تجربوں، مشاہدوں اور کھوج سے حاصل کئے گئے کائنات کے حقیقی علم کو آزادی سے استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے ورنہ انسان اپنے آپ کو کائنات سے ہم آہنگ نہیں کر سکتا اور اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار نہیں رکھ سکتا۔ مذہب کی قید، کلچر کی قید انسانی سوچ کو برو ارجھ جنے سے روکتی ہے

اور سوچ پر روک انسانی جنس کی بقار کے منافی ہے ۔

انسان صدیوں سے آزادی کا نقطہ موقعہ بے موقعہ، محل بے محل اُچھالتا آیا ہے۔ کبھی خوراک حاصل کرنے کی آزادی کا راگ الاپتا ہے۔ کبھی گھومنے پھرنے کی آزادی کی رٹ لگاتا ہے۔ اور کبھی سوچنے سمجھنے کی آزادی کو دہراتا ہے اور آخر میں روحانی آزادی یا حقیقی آزادی کا رونا روتا ہے۔ ایسی آزادی جہاں انسان پر کوئی روک نہ ہو۔ یعنی نروان، مکتی۔ نجات۔

لیکن سوچنے کی بات ہے۔ کیا انسان کا وجود حقیقی طور پر آزاد ہو سکتا ہے یہ سوال انسان کے ذہن میں ارتقار کے اولین لمحے سے سرگرداں ہے۔

خوراک حاصل کرنے کی آزادی مل بھی جائے تب بھی انسان خوراک اُگنے کی قوت کے طابع رہیگا۔ طوفان، سردی، گرمی اور درندوں کی دسترس سے آزاد ہو بھی جائے۔ تب بھی انسان کپڑے مکان، کوئلہ یا مادے کی مختلف صورتوں کے طابع رہیگا گھومنے پھرنے کی آزادی بھی مل جائے۔ تب بھی انسان دریاؤں، سمندروں پہاڑوں صحراؤں اور کشش ثقل کے حدود کا غلام رہیگا۔ سوچ سمجھ

کی آزادی مِل بھی جائے تب بھی انسان کائنات کے اصولوں حقیقتوں پر مبنی علم میں پابند رہیگا۔

خوراک پیدا نہ ہو تو انسان اپنی حالت بدستور برقرار نہیں رہ سکتا۔ کشش ثقل میں تغیر ہو تو انسان کی حالت بدستور برقرار نہیں رہ سکتی۔ مادے کی صفات بدل جائیں تو انسان کا جسم برقرار نہیں رہ سکتا۔ اس کا دماغ برقرار نہیں رہ سکتا۔ اس کی سوچ برقرار نہیں رہ سکتی۔ اُسکی حرکت برقرار نہیں رہ سکتی اور انسان بحیثیت جنس بدستور برقرار نہیں رہ سکتا۔

انسان کی حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے ایک خاص ماحول کی ضرورت ہے۔ جس ماحول کی قوت کے طابع انسان انسانی جنس کی مخصوص صورت میں بدستور برقرار رہ سکتا ہے۔

کھوج، پرکھ اور مشاہدے سے انسان اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ نقطہ "آزادی" انسان کی زبان (Language) میں اضافی ہے اور کائنات کے حقیقی علم سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے انسان نے وقتاً فوقتاً ایجاد کیا ہے۔ مذہبی آزادی، قومی آزادی، ملکی آزادی حتےٰ کہ حقیقی آزادی صرف مفروضے ہیں۔ دراصل انسان اپنے جسم کا

غلام ہے اپنی فطرتوں کا غلام ہے۔ اپنی حالت کا غلام ہے اور صرف مادے کے اثر صفات میں پابند رہ کر اپنی مخصوص حالت بدستور برقرار رکھ سکتا ہے۔

تجربے ہوتے رہتے ہیں۔ مشاہدے ہوتے رہتے ہیں اور تحقیقیں آگے بڑھتی جاتی ہیں لیکن انسان کا وجود مادے کی صفات میں پابند ہو کر بھی، مادے کی صفات سے آشنا ہو کر بھی، مادے کی حقیقت اور قوت سے انحراف کرنے کی کوشش میں ہے۔ کائنات کے اٹل اصولوں سے منہ موڑ کر روحانی مذہبی مفروضات پر بدستور ایمان رکھتا ہے۔ کیا وجہ ہے؟ اس نکتہ کی وضاحت کے لئے انسان کو ایک بار پھر غور سے مادے کی صفات کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

صحرائی علاقے میں انسان جنم لیتا ہے۔ صحرا میں تیز دھوپ ہوتی ہے اونچی حرارت ہوتی ہے۔ ماحول جسم سے زیادہ گرم ہوتا ہے لیکن انسان کا جسم دھیرے دھیرے اس ماحول کا خوگر ہو جاتا ہے یا انسان کے بدن میں تیز گرمی برداشت کرنے کی صفت پیدا ہو جاتی ہے اور صحرائی علاقے کا انسان تیز دھوپ اور تیز حرارت کے ماحول کے مطابق اپنی صفات بدستور برقرار رکھ سکتا ہے۔

صحرائی علاقے کا انسان ایک لمبے عرصے تک ... اور ... ہوتا ہے۔ ایک

انسان کو برفیلے علاقے میں اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے میں دشواری پیش آتی ہے جبکہ برفانی علاقے کا خوگر انسان کوئی دشواری محسوس نہیں کرتا۔ صحرائی خطے کے انسان کے بدن میں "ڈھیل" موجود نہ ہو تو کسی صورت اپنی حالت برفیلے علاقے میں برقرار نہیں رکھ سکتا اور ٹھنڈ کی تاب نہ لا کر مر جاتا ہے۔ بدن میں ڈھیل موجود ہو تو صحرائی خطے کا انسان برفانی ماحول کا خوگر بن جاتا ہے۔ حرارت برداشت کرنے کی صفت سردی برداشت کرنے کی صفت میں منتقل ہو جاتی ہے۔

یہ بات مادے کے ذرّوں میں پنہاں ڈھیل کی کمی بیشی کے تناسب سے ہے کہ وہ بآسانی نئے ماحول کے طابع ہو جاتا ہے اور نئے ماحول میں اپنی حالت بدستور برقرار رکھ سکتا ہے۔

دماغ انسان کے جسم کا حصہ ہے۔ اور سوچ دماغ کی صفت ہے۔ مخصوص ماحول میں پلا دماغ مخصوص سوچ کو جنم دیتا ہے۔ ماحول بدل جائے تو دماغ میں پنہاں ڈھیل کے تناسب سے سوچ بھی بدل جاتی ہے۔

دماغ میں ڈھیل زیادہ ہو تو سوچ میں بھی ڈھیل زیادہ پیدا ہو گی۔ دماغ میں ڈھیل کم ہو تو سوچ میں بھی ڈھیل کم ہو گی۔

دماغ میں ڈھیل مادے کے ذرّوں اور قوت کے ذرّوں کے تناسب

سے موجود ہوتی ہے۔ دماغ میں مادے کے ذرّے مقدار میں زیادہ ہوں تو بھیل
زیادہ موجود ہوگی اور دماغ طاقتور کہلاتا ہے جو مختلف قسم کے ماحولوں میں اپنی
سوچ کو ڈھال سکتا ہے۔ دماغ میں مادے کے ذرّوں کی مقدار کم ہوگی اور
دماغ کمزور کہلاتا ہے جو مختلف ماحولوں میں اپنی سوچ کو ڈھال نہیں سکتا۔

چونکہ انسان کی حرکات و سکنات دماغ کے طابع ہوتی ہیں اسلئے
انسان مختلف ماحولوں میں دماغ کے تناسب سے مختلف اثر قبول کرتا
ہے۔ روئے زمین پر مقدار کے لحاظ سے انسان کا دماغ ہر جاندار کے دماغ
سے زیادہ ہے۔ اس لئے انسان کی سمجھ سب جاندار سے زیادہ ہے۔ یہی
وجہ ہے کہ انسان کمزور جسم کا مالک ہونے کے باوجود اپنے طاقتور دماغ
کے بل بوتے پر اپنے سے زیادہ طاقتور جسم کا مالک ہونے والے لیکن کمزور
دماغ رکھنے والے درندوں، پرندوں، جانوروں پر حاوی ہے۔ جیسے کہ کمزور
دماغ رکھنے والے ہم جنس پر بھی غلبہ پالیتا ہے۔ طاقتور دماغ کے انسان
نے کمزور دماغ کے انسان کو محکوم بنا رکھا ہے۔

ایک انسان ڈاکٹری علم سیکھ کر جان جاتا ہے کہ اس کی بیوی کے
بدن میں تولیدی اعضاء کی ساخت بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ اس
لئے بچہ پیدا ہونا ناممکن ہے چونکہ ڈاکٹر پیدائش سے [illegible] دماغ میں [illegible] کسی

خاص مذہبی ماحول میں پلا ہے۔ جیسے ڈاکٹری علم سے بہرہ ور ہونے کے باوجود اس کی سوچ مذہب اور روحانیت کی غلام رہتی ہے اور اس سوچ کے زیر اثر مذہبی روحانی رسم و رواج کا سہارا لے کر مندر، مسجد میں پہنچنے کے لئے گڑگڑاتا ہے۔ دعائیں مانگتا ہے۔ نیاز بانٹتا ہے یہ حرکت صدیوں کے دوران حاصل کئے گئے کائنات کے علم سے صریحاً انحراف ہے۔ ڈاکٹری علم سے بہرہ ور ہونے کے باوجود ایسے انسان کی سوچ فرسودہ ہے۔ دقیانوسی ہے۔ ایسے انسان کو کسی حالت میں عالم نہیں کہا جا سکتا۔ ایسے ڈاکٹر کو ان پڑھ، کم دماغ یا جاہل ڈاکٹر کے نام سے پکارنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ ایسا ڈاکٹر، ڈاکٹری علم سیکھنے کے بجائے مندروں، مسجدوں میں جاکر دوائی کے بجائے تعویذ ٹوٹکے اور دعائیں پڑھ پڑھ کر بیماروں کو مرض سے نجات دلانے کی کوشش کرے۔ اگر ڈاکٹری علم کے بجائے مندروں، مسجدوں کا علم اس قدر ہوتا کہ لوگوں کی بیویوں کو بچے دلاتا پھرے تو ڈاکٹر براہِ راست خود بچہ جننے کی دعا کیوں نہیں مانگتا کیونکہ دعا کے وقت بھی مادے کی صفات اور کائنات کے اٹل اصول میں تبدیلی لا کر بیویوں کے ہاں بچہ

جتنی کی فیس مانگتا ہے۔ مذاق تو یہ ہے کہ بڑے بڑے مذہبی رہنما۔
انسانی روحانیت کے علمبردار بیمار ہو جاتے ہیں تو مذہبی اور روحانی رسوم
کی پیروی کرنے کے بجائے ڈاکٹری (مادے کے علم) کی طرف رجوع
کرتے ہیں۔ مادے کے ذرّوں سے بنی دوائیوں کے استعمال کو
اولین ترجیح دیتے ہیں۔

مادے سے بنی دوائیوں سے انسان بیماری سے نجات پاتا
ہے چاہے مذہبی اور روحانی رسوم کی پیروی کرے یا نہ کرے لیکن صرف
مذہبی اور روحانی رسوم کی پیروی مریض کو مرض سے نجات نہیں دلاتی
جب تک کہ مادے کی صفات پر مبنی ڈاکٹری علم کا سہارا نہ لیا جائے۔

عورتیں مردوں کی دست اندازی اور ظلم و ستم سے پریشان
ہو کر عام طور پر دعائیں مانگتی رہتی ہیں کہ کاش وہ مرد بن جائیں اور
مردوں سے بدلہ لے سکیں لیکن دعاؤں کے صدقے عورت ذات
کبھی مرد ذات میں تبدیل نہ ہوئی۔ جبکہ ڈاکٹروں نے مادے کی
صفات کا سہارا لے کر کئی عورتوں کو مرد ذات میں تبدیل کیا اور کئی
مردوں کو عورت ذات میں تبدیل کیا۔ ذات بدلنے کی بات تو
معمولی ہو گئی ہے اب تو انسان مادے کے علم سے اتنا ہی ہو گیا ہے۔

کہ مادے کے مختلف ذرّوں کو نئی ترتیبیں دے کر نئے اور بہتر نباتات اور حیوانات کی نسل وجود میں لانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ انسان نے علم حاصل کرنے کی رفتار یہی رہی تو وہ دن دور نہیں جب انسان صرف مٹی کی چٹکی سے ایک نئے انسان کو تشکیل کر لے گا۔

ایک ڈاکٹر کی کیا بات۔ دنیا میں ایسے ہزاروں جاہل ان پڑھ، فلسفی، انجینئر، وکیل، سائنسدان، سیاست دان، لیڈر موجود ہیں جو روزمرہ مادے کے صفات پر مبنی علم سے مستفید ہوتے رہتے ہیں لیکن مادے کے صفات پر مبنی علم پر ایمان نہیں لاتے اور انسانی جنس کو قدم قدم پر گمراہ کرتے رہتے ہیں۔

لیڈروں نے سیاستدانوں نے، مذہبی پیشواؤں نے، روحانی شعبدہ گروں نے وقت وقت پر مختلف مذہب، کلچر، رنگ، نسل اور قوم کے فرضی ماحول میں انسانی سوچ کو پابند تو کر دیا لیکن کائنات کی تغیر جاودانی نے ہر ماحول میں انتشار پیدا کر کے انسان کی سوچ کو رائج ماحول سے بغاوت کرنے پر آمادہ رکھا۔

کائنات ہر وقت حرکت میں رہتی ہے۔ اسلئے ہر ماحول میں انتشار (حرکت) لازمی ہے۔ ماحول کا انتشار سوچ پر حاوی ہو کر انسان کی سوچ کو بدلنے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن پھر نئے مذہب میں سے نئے مذہب نے سر ابھارا۔

پرانے خصوصیات سے نئے کچھ نے وجود پایا۔ پرانی تہذیب کی جگہ نئی تہذیب چھا گئی۔

پرنیا مذہب، نیا کلچر یا عمومی طور پر نئی تہذیب، پرانی تہذیب سے ترقی پذیر ثابت ہوتی ہے۔ اور پرانی تہذیب کی غیر حقیقی قدریں رد کر کے کچھ نئی قدریں اپنائی ہیں۔

انسان مدراس میں پیدا ہوا۔ مدراس کے مخصوص ماحول میں پروان چڑھا۔ مدراس میں رائج رسم و رواج، کلچر، مذہب کا پابند ہوا۔ مدراسی زبان بولنے لگا۔

انسان پنجاب میں پیدا ہوا۔ پنجاب کے مخصوص ماحول میں پروان چڑھا۔ پنجاب میں رائج رسم و رواج، کلچر، مذہب کا پابند ہوا۔ پنجابی زبان بولنے لگا۔

پنجابی انسان کسی کام سے مدراس گیا۔ مدراسی ماحول سے آشنا ہو گیا۔ مدراسی زبان سیکھ گیا۔ یوں اپنے ذہن کو دو زبانوں سے آراستہ کیا۔ زبان کے لحاظ سے پنجاب کے انسان کی سوچ مدراس کے انسان کی سوچ سے زیادہ طاقتور ہو گئی۔

پنجاب کے انسان نے مدراس کے انسان کو پنجابی زبان میں گالی دی۔ چونکہ مدراسی انسان پنجابی زبان سے نابلد تھا۔ اس لئے مدراس کا انسان پنجابی زبان کو اپنی سوچ سے منسلک نہ کر سکا۔ اس پر گالی کا کوئی رد عمل نہیں ہوا۔ اور وہ چپ چاپ کھڑا پنجاب کے انسان کو دیکھتا رہا۔ سنتا رہا۔

پنجاب کے انسان نے مدراس کے شخص کو زبان میں گالی دی۔ چونکہ

مدراسی یا اس زبان سے قائم نہیں تھا۔ اس لئے وہ مدراسی زبان کے لفظ "گالی" کو اپنی سوچ سے منسلک کر سکا۔ مدراسی زبان کے طابع پیچ بخور کسا اٹھی اور وہ پنجاب کے انسان پر ٹوٹ پڑا۔ حالانکہ گالی کا حرف آواز کی صفت تک محدود تھی اور حرکت کی حدود میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن مدراسی زبان کا ردِ عمل مدراس کے انسان کے ذہن پر حاوی تھا۔ اس لئے مدراس کا انسان اپنی سوچ کے تابع انتشار میں مبتلا ہو گیا اور اس کا وجود گالی سمجھ کر ہی حرکت کی حدود میں داخل ہو گیا۔ یوں زبان کے لحاظ سے طاقتور پنجاب کے انسان کے ذہن نے صرف آواز کی لہریں استعمال کر کے زبان کے لحاظ سے کمزور مدراس کے انسان کے ذہن کو قابو میں کر کے اس کی حرکات کو تابع کر دیا۔

چھوٹے بچے کا ذہن کمزور ہوتا ہے کیونکہ اپنی مختصر سی زندگی میں وہ کافی تجربوں سے دوچار نہیں ہوا ہوتا ہے اس لئے بہت حد تک بزرگوں کے اخذ کئے گئے نتیجوں کا پابند ہوتا ہے۔

بزرگ اپنی بزرگی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر خوف ڈر اور مختلف قسم کی روک ٹوک بچوں کے کمزور ذہن پر ان کو قابو میں رکھنے کے لئے لگاتے ہیں۔ [illegible]

بچوں کو توہمات اور رسم و رواج کا پابند کر دیتے ہیں۔ بچہ سو جاتا ہے لیکن ڈر، خوف کے جذبات اس کے ذہن میں اودھم مچاتے رہتے ہیں۔ آنکھیں بند ہوتے ہوئے بھی بچے کا دماغ جاگتا رہتا ہے۔ اسلئے اس کا ذہن جنوں، بھوتوں کے سپنے بنتا ہے۔ کبھی جنوں کو اڑتے دیکھتا ہے اور کبھی بھوتوں کو ناچتے دیکھتا ہے۔ پریوں کی کہانیاں سنی ہوں۔ تو پریوں کو رنگ رلیاں مناتے دیکھتا ہے۔

یاداشت کی کمزوری یا ذہن کی کمزوری یا بیماری کی وجہ سے دماغ کے مادے کے ذروں میں انتشار پیدا ہو جائے تو سوچ میں افراتفری پھیل جاتی ہے۔ اور بچہ پری کے پیر جن کے بدن سے منسلک کرتا ہے۔ جن کے سینگ انسان کی شبیہ سے جوڑ دیتا ہے۔ ایسے اشکال گڑھ لیتا ہے جن کے وجود سے بچہ بے بہرہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایسے اشکال بھی گڑھ لیتا ہے۔ جن کا کائنات میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یوں کمزور ذہن میں کمزور سوچ کی وجہ سے فرضی اشکال، ڈھکوسلے، توہمات جنم لیتے ہیں۔

خون کے دباؤ کا بیمار (Blood Pressure) تیز بخار میں مثلاً انسان یا کسی ذہنی بیماری سے متاثر انسان بالغ ہو کر بھی ایسی ہی حرکات

کا مرتکب ہوجاتا ہے۔ شراب، بھنگ، L.S.D، و دیگر نشہ جات بھی

دماغ کے مادے کے ذرّوں کی حالت میں انتشار پیدا کر کے انسان کو ایسی فرضی کہانیاں گڑھنے پر مجبور کرتے ہیں کہ عام ذہن رکھنے والے انسان حیران رہ جاتے ہیں۔ دماغ اور اس کی ماہیت کی پوری جانکاری نہ ہونے کی وجہ سے تندرست ذہن رکھنے والے انسان کا ذہن بھی ڈانواڈول ہو جاتا ہے۔

دماغ کے مادے کے ذرّوں کی ایسی ہی حرکات کا سہارا لے کر طاقتور ذہن کے انسان کمزور ذہن کے انسان کو طابع کرتے ہیں۔ ہپناٹزم، (Hypnotesim) مسمریزم (Messmaxism) جادو ٹونا تعویز گنڈے، شعبدے، معجزے طاقتور ذہن کے انسان کا کمزور ذہن کے انسان پر قوت کا ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں۔

دنیا کی سطح پر انسان نے سب سے پہلے (Load Stone) پتھر میں مقناطیسی صفات پائیں۔ تجربے اور مشاہدوں کی بنا پر لوہے کے ذرّوں میں بھی ایسی صفات پنہاں ملیں۔ کھوج اور پرکھ نے یہ صفات پلاسٹک (Plastic) ہاتھی دانت (Ivory) ابونی (Ebony) نیلان (Nylon) وغیرہ میں بھی آشکارا کیں۔ (Magnet) ہے کا مقناطیس جہاں صرف لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے وہاں پلاسٹک (Ebony) ابونی وغیرہ کھال کے ٹکڑوں اور کاغذ کے ذرّوں کو اپنی

طرف کھینچتے ہیں۔ یہ کھینچنا طاقت کا ردِ عمل ظاہر کرتا ہے۔ کبھی اپنے سے دور بھی دھکیل دیتے ہیں۔ اپنے سے دور دھکیلنا بھی طاقت کا ردِ عمل ظاہر کرتا ہے۔ آخر میں سائنسدان نیوٹن (Newton) نے تجربوں اور تحقیق کے بعد اس حقیقت کا انکشاف کیا۔ کہ کائنات میں ہر چیز دوسری چیز کو کھینچتی رہتی ہے۔ دماغ کا ہر ذرّہ دوسرے فلسفہ کے ذرّے کو کھینچتا ہے یا حرکت کو آزاد کرتا ہے۔ ارتقاء کے ساتھ ساتھ انسانی دماغ کی قوت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اب تو حالت یہاں تک آگئی ہے کہ کئی انسانوں کا دماغ اتنا طاقتور بن گیا ہے کہ صرف ذہن کی طاقت سے اشیاء کو ہلا لیتا ہے۔ آگ پیدا کر لیتا ہے۔ کچھ گز دور آواز کی لہروں سے ہی نہیں بلکہ میلوں دور مقناطیسی لہروں (Magnetic waves) سے کسی اور انسان کو عجیب و غریب حرکات کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جسے عام طور پر (Telepathy) ٹیلی پیتھی کے عمل کا نام دیا گیا ہے۔ اور کم علم کمزور دماغ رکھنے والا انسان ان حرکات کا کوئی ظاہری جواز نہ پاکر دماغ کے ان عملیات کو روحانی، خدائی طاقت سے وابستہ کرتا ہے اور مفروضیہ پر ایمان لاتا ہے۔ دماغی طاقت کو غیر مرئی طاقت سمجھتا ہے۔ مادے کی طاقت نہیں سمجھتا۔

انسان اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے کائینات کی ہر اور صورت یا حالت (state) مثلاً ہوا، پانی، مٹی، آگ، درندہ، جانور، جراثیم وغیرہ سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔ اور کائینات کی ہر دوسری صورت یا حالت اپنی صورت یا حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے انسان کی صورت یا حالت بدستور برقرار رکھنے پر تلی ہے۔ لیکن انسان طاقتور دماغ سے لیس ہوتے کے باوجود اپنی جنس سے بھی برسرِ پیکار رہتا ہے۔ ہٹ دھرمی اور جہالت کی وجہ سے اپنے وجود کے لئے اور خطروں کا اضافہ کرتا ہے۔ آپس میں برسرِ پیکار رہنے کے بجائے انسانی جنس اجتماعی صورت میں کائینات کی ہر اور جنس کے سامنے صف آرا ہو جائے تو انسان بڑی آسانی سے اپنی حالت بدستور برقرار رکھ سکتا ہے۔ انسان کے لئے لازم بن جاتا ہے کہ صدیوں سے سمیٹے کائینات میں پھیلے مادے پر مبنی اٹل حقیقتوں اصولوں کو دانشمندانہ انداز میں اپنے مادے سے بنے وجود پر مسلط کرے اور یوں کائینات سے ہم آہنگ ہو کر اپنی جنس کی بقا کا سامان کرے۔

زندگی سے مزین ہر شئے کے پاس اپنی صورتوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا بیج کے پاس پودے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ انڈے کے پاس جاندار کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ انسان کے پاس جسم کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے کہ انسان کے پاس

تن ڈھانپنے اور پیٹ بھرنے کے لئے خوراک نہیں ہوتی۔ اسلئے انسان کو اپنے جسم کے سوا کسی اور چیز پر قبضہ جمانے کا کوئی جواز نہیں۔ باغ، باغیچے، مکان، پہاڑ، سونا چاندی، سمندر، آسمان۔ کل کائینات انسانی جنس کی مشترکہ وراثت ہے۔ ان پر یا ان کے کسی بھی حصے پر کسی ایک فرد کا قبضہ نا جائیز ہے غلط ہے۔ کائینات کے اصولوں کے منافی ہے۔ یہ بدعت فرضی حدود پیدا کر کے بھائی کو بھائی سے جدا کرتی ہے۔ اولاد کو والدین سے جدا کرتی ہے۔ بیوی کو خاوند سے جدا کرتی ہے۔ انسان کو انسان سے جدا کرتی ہے۔ اس لئے انسان کے ذہن سے ملکیت، وراثت، جائیداد جیسی غیر قدرتی سوچ مٹانے کی ضرورت ہے۔ یوں ایک انسان دوسرے انسان کا پابند نہ رہ کر استحصال کی لعنت سے مبرا ہو جائیگا اور حقیقی اجتماعی صورت حاصل کرے گا۔

خدا کا وجود ارتقاء کے اولین لمحے سے موجودہ دور تک نا فہم رہا ہے۔ مان بھی لیا جائے کہ خدا کا وجود ہے پھر بھی خدا کا پیر تو صرف مادے کی صفات میں پنہاں ملتا ہے۔ اسلئے صرف مادے کی صفات کے طابع رہ کر ہم خدا کی خدائی سے فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ مبہم اور فرضی ڈھکوسلوں کے تحت نہیں۔

ہر زمانے میں انسانی ارتقاء کی مخالف منبروں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ لیکن

بذاتِ خود منزل نہیں انسان کے علم کو الگ الگ اکائیوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔
علم تو مسلسل کوشش ہے کائینات کے مسلسل دورِ عمل کی جانکاری کا۔

اسلئے پاک ناپاک، گناہ، ثواب، حلال، حرام یا مجموعی طور پر مذہب مادے کی صفات اور انسانی جنس پر ان صفات کے رد عمل پر مبنی ہونا چاہئے۔ فرضی ڈھکوسلوں اور توہمات پر نہیں۔ اس صورت میں مادے کی خاصیت اور رد عمل پر مبنی مذہب "انسانیت" مادے سے بنے انسانی جنس پر حاوی ہوتا ہے۔ جنت اور جہنم یا دوسری کائینات کا کوئی وجود نہیں یہ صرف انسان کی لاعلمی کی دلیل ہے۔ انسان کو اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے لوازمات میسر رہیں تو جنت میں ہے اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے کیلئے لوازمات میسر نہ رہیں تو جہنم میں ہے۔

رنگ، نسل، کلچر، قوم انسانی جنس کی بنیادی صفات نہیں۔ بلکہ یہ [illegible] ماحول کی پیداوار ہیں اور انسانی جنس کی ظاہری شکل و صورت تک محدود ہیں۔ اسلئے انسان کے ذہن سے رنگ، نسل، کلچر، قوم کی تفریق مٹانے کی ضرورت ہے۔ یوں انسان انسان کے نزدیک آکر اجتماع کی صورت میں کائینات کی ہر دوسری جنس کو اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

انسان کی اصلی دولت جائیداد، روپیہ پیسہ نہیں بلکہ انسان کی طاقت ہے جیسے انسان صرف کرکے محنت کر سکتا ہے اور اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے کے لئے خوراک، کپڑا، مکان اور زندگی کے دیگر لوازمات پیدا کر سکتا ہے۔

محنت کا اوزان وقت یا پیداوار کی صورت میں نہیں ہونا چاہئے بلکہ انسان کی ضروریات کی صورت میں ہونا چاہئے۔ بیج کے اندر پلتے پودے کیلئے قدرت بیج کے ارد گرد خوراک گودے کی صورت میں تب تک میسر رکھتی ہے جب تک کہ پودا خود خوراک حاصل کرنے (محنت) کے قابل نہ ہو جائے۔ انڈے کے اندر پلتے جانور کے لئے قدرت انڈے کے اندر خوراک انڈے کی سفیدی کی صورت میں تب تک کیلئے میسر رکھتی ہے جب تک کہ جاندار خود خوراک حاصل کرنے (محنت) کے قابل نہ ہو جائے۔

پیدائش پر انسان کیلئے قدرت نے ماں کے جسم میں خوراک دودھ کی صورت میں تب تک کیلئے میسر رکھا ہے جب تک کہ انسان خود خوراک حاصل کرنے (محنت) کے قابل نہ ہو جائے۔

زندگی کو مذہب و ملت، نسل و قوم، قابلیت یا ناقابلیت کی تفریق کے باوجود ہر صورت ہر حالت میں خوراک تب تک میسر رہتی ہے جب تک کہ زندگی خود اپنی خوراک حاصل کرنے (محنت) کے قابل نہ ہو جائے۔

اِسلئے ہر انسان چاہئیے جوان ہو، بوڑھا ہو، بچہ ہو، تندرست ہو، بیمار ہو، اپاہج ہو۔ محنت کرنے کے قابل ہو یا محنت کرنے کے ناقابل ہو خوراک اور زندگی کے دیگر لوازمات کا حق رکھتا ہے۔ کائینات کے اس اٹل اصول کا اطلاق تب ہی ممکن ہے۔ جب سب محنت کرنے کے قابل انسان حسب اوقات محنت کر کے زندگی برقرار رکھنے کے لوازمات پیدا کرینگے اور محنت نہ کرنے کے قابل انسانوں کے ساتھ حسب ضرورت بانٹ کر استعمال کرینگے۔ ہاں جو محنت کرنے کے قابل ہونے کے باوجود محنت کرنے سے احتراز کرے۔ اُس انسان کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔

کل کائینات میں صرف انسانی جنس طاقتور دماغ کی بدولت اس قابل ہے کہ تجربوں کھوج اور پرکھ سے کائینات میں پنہاں رازوں اصولوں اور حقیقتوں کی نقاب کشائی کرے اور ان کا صحیح اطلاق کر کے اپنی جنس کی آبیاری کرتا رہے۔ اس صفت کی وجہ سے انسان نے اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کے نام سے نوازا ہے۔ یعنی کائینات کی ہر جنس ہر مخلوق سے برتر۔

— تمت —